دسمبر ۲۰۰۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک عظیم قومی سانحہ — خدائی تنبیہہ

۸؍اکتوبر ۰۵ء کو صبح نو بجے پاکستان کے شمال مشرقی خطے کا وسیع و عریض علاقہ ایک ہولناک آفت ارضی کی لپیٹ میں آیا، جس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مکانات تباہ ہو گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد جاں بحق ہوئے، ہزار ہا زخمی ہوئے اور لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ یہ آفت ارضی ہمارے لیے قومی سطح پر ایک عظیم آزمائش اور ہمارے ربّ کی جانب سے ایک انتباہ عظیم سے کم نہیں، اس لیے کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَا اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ (التغابن: ۱۱)

''نہیں پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے''۔

﴿وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿ؕ۳۰﴾﴾ (الشوریٰ)

''اور جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے ہے اور اللہ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی کرتا ہے''۔

جی ہاں! یہ ہمارے اجتماعی جرائم کا شاخسانہ ہے جو قوم کو جگانے کا ذریعہ اور آخرت کے بڑے عذاب سے قبل ایک شدید وارننگ کا درجہ رکھتا ہے۔ بقول اقبال ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

یہ درست ہے کہ افراد کے لیے حقیقی دارالجزاء تو آخرت ہی ہے لیکن اللہ کی سنت ہے کہ بعض اوقات قوموں کے اجتماعی جرائم کی کسی قدر سزا دنیا میں بھی قوم کے ایک حصے پر مسلط کر دی جاتی ہے تاکہ بقیہ قوم اُس سے سبق حاصل کرے اور اللہ اور اُس کے دین سے انحراف کی روش ترک کر کے اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائے۔ سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَنُذِیۡقَنَّہُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰی دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَکۡبَرِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ﴾

''اور ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں تاکہ وہ (اللہ

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\arz-december.inp 8/22/2014 3:28 PM PAGE 1 (1,1)

کی طرف) رجوع کریں''۔

سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ جب انہوں نے احکام الٰہی کی خلاف ورزی، اللہ کی کتاب کی ناقدری اور دین و شریعت سے انحراف کی روش اختیار کی تو اُن پر بار بار اللہ کی طرف سے مختلف قسم کے عذاب مسلط کیے گئے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:٦١)

''اُن پر ذلت اور مسکنت کا عذاب مسلط کر دیا گیا اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔

اور

﴿وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾﴾ (الاعراف)

''اور ہم نے ظلم کرنے والوں کو بدترین عذاب میں پکڑا، ان کی نافرمانی کی پاداش میں''۔

اور

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ﴾ (المائدۃ:١٨)

''(اے نبیؐ) فرما دیجیے: پھر اللہ تمہارے گناہوں پر (دنیا میں) تم پر عذاب کیوں بھیجتا رہا؟''

واضح رہے کہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ کے مطابق جب کسی مسلمان قوم کے جرائم کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے عذابِ عام آتا ہے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور بے گناہ افراد اور معصوم بچے بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ایسے بے گناہوں کو آخرت کی ابدی زندگی میں لامحدود اجر و ثواب سے نوازا جائے گا، جو ان کے لیے حقیقی سرمایۂ حیات ثابت ہوگا۔ لیکن قوم کے وہ افراد اور طبقات جو ایسی خدائی تنبیہات اور عذابِ الٰہی کے چھوٹے جھٹکوں سے سبق نہ سیکھیں اور اللہ کے دین سے بے وفائی اور عصیان پر مُصر رہیں وہ شدید ترین عذاب کے مستحق بن جاتے ہیں۔

چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس جھنجھوڑ دینے والی خدائی تنبیہہ سے سبق سیکھتے ہوئے اور آزمائش کی اس سخت گھڑی میں اپنی قومی و ملی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ہم:

۱) زلزلہ زدگان کی امداد اور بحالی کے کام میں انسانی ہمدردی اور اخوتِ اسلامی کے جذبے سے سرشار ہو کر ان متاثرین زلزلہ کے ساتھ دامے، درمے، سخنے بھرپور تعاون کریں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ زلزلہ زدگان کی بحالی کا کام مناسب حد تک تکمیل پذیر نہیں ہو جاتا۔

۲) جو لوگ اس حادثے میں جاں بحق ہو چکے ہیں، ان کی مغفرت کے لئے تہہ دل سے دُعا کریں اور زخمیوں کے علاج معالجے اور عیادت کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو احسن طور پر ادا کریں۔ (باقی صفحہ 50 پر)

بقیہ: عرضِ احوال

۴) انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خلوص دل کے ساتھ توبہ کریں۔ افرادِ قوم اپنے سابقہ گناہوں اور کوتاہیوں پر سچے دل سے استغفار کریں اور آئندہ کے لیے اصلاحِ احوال پر کمر بستہ ہو جائیں اور پھر مل جل کر اپنے قومی جرم کی تلافی کے طور پر پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ یعنی نظامِ خلافت کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ تو کیا عجب کہ مسلمانانِ پاکستان جو ایک طویل عرصے سے بعض اعتبارات سے نہایت مایوس کن قومی و ملی حالات کے باعث شدید ذہنی کرب سے دوچار تھے' از سرِ نو ایک زندہ قوم بن کر ؎

''صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب''

کا روپ دھار لیں اور یہ مملکت خداداد پاکستان صحیح معنوں میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے خوابوں کی سچی تعبیر بن کر اسلام کا ایک عظیم قلعہ اور یہود و نصاریٰ کے مذموم عزائم کی راہ میں ایک ناقابلِ تسخیر چٹان ثابت ہو' اور اسلام کے عالمی غلبے اور پان اسلام ازم کی جانب سفر میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کر سکے۔ ؏ ''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!''

تذکرہ و تبصرہ

عظمتِ قرآن بلسانِ نبوتؐ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا

۱۲/نومبر۲۰۰۴ء کا خطاب جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰـہُ اِلَـیۡکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ﴾(صٓ)

رمضان المبارک کا دوگونہ پروگرام اور اس کا حاصل

رمضان المبارک کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا اصل تحفہ قرآن حکیم ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی : ﴿شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا''۔ اس میں جو دو عبادات رکھی گئیں' ان میں سے ایک کو فرض قرار دیا گیا اور ایک کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ رمضان میں دن کا روزہ فرض قرار دیا گیا' جبکہ اللہ تعالیٰ نے رات کا قیام بندے کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں قیام اللیل کی بہت زیادہ ترغیب دلائی ۔ چنانچہ احادیث میں دن کے روزے اور رات کے قیام کا ذکر بالکل متوازی طور پر ہوا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے:

((مَنۡ صَامَ رَمَضَانَ اِیۡمَانًا وَّاحۡتِسَابًا غُفِرَ لَـــــــہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِہٖ ' وَمَنۡ قَامَ رَمَضَانَ اِیۡمَانًا وَّاحۡتِسَابًا غُفِرَ لَـــــــہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِہٖ))

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے

ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' فَیُشَفَّعَانِ)) (رواہ احمد والطبرانی والبیھقی)

''روزہ اور قرآن بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اِس بندے کو دن کے وقت کھانے پینے سے اور اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنے سے روکے رکھا' تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما! قرآن کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اِس بندے کو رات کے وقت سونے سے روکے رکھا' تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما! پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

رات کو جاگنا درحقیقت جو مطلوب ہے وہ کم سے کم تہائی رات ہے۔ ورنہ آدھی رات یا دو تہائی رات قیام کیا جائے' جیسا کہ سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ لیکن یہ کام ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ مزدور اور کاشت کار جو دن بھر محنت کرتے ہیں' ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کا قیام فرض نہیں کیا گیا۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں تراویح کا نظام جاری کر دیا کہ نمازِ عشاء کے ساتھ متصلاً بیس رکعت میں لوگ ایک پارے کے لگ بھگ قرآن سن لیں' تاکہ ہر مسلمان اس مہینے میں قرآن میں سے گزر جائے۔ ان لوگوں کا تو معاملہ یہ تھا کہ ان کی اپنی زبان عربی تھی اور ان کے لیے قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کا سننا ہی کافی تھا۔ وہ براہِ راست ان کے ذہن وقلب میں سرایت کر جاتا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں رمضان المبارک کے پورے پروگرام کا حاصل بایں الفاظ بیان کر دیا گیا: ﴿وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰٮکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾ ''اور تاکہ تم اللہ کی

بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی اور تاکہ شکر کرو''۔ یعنی قرآن جیسی نعمت جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے' اس کا شکر اسی مناسبت سے ادا کرسکو۔ میں نے بارہا مثال دی ہے کہ کسی بچے کے ہاتھ پر اگر ہیرا رکھ دیجیے تو اس کے اندر کوئی جذبۂ تشکر پیدا نہیں ہوگا۔ وہ تو سمجھے گا کہ یہ کانچ کا کوئی ٹکڑا ہے جو میرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے' لیکن یہی ہیرا کسی جوہری کے ہاتھ پر رکھیے جسے اس کی قدر و قیمت معلوم ہے تو اس کے اندر سے جو جذباتِ تشکر ابلیں گے ان کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ تو جب آپ پر قرآن کی عظمت منکشف ہوگی تبھی آپ اس نعمت کا اتنا شکر ادا کر سکیں گے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ رمضان المبارک کا دوگونہ پروگرام عظمتِ قرآن کے انکشاف کے لیے رکھا گیا کہ دن میں روزہ رکھو' تاکہ تمہیں کچھ تقویٰ کی پونجی حاصل ہو جائے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ اور رات کو قرآن کے ساتھ کھڑے رہو' تاکہ قرآن مجید کی عظمت تم پر منکشف ہو اور اس کی عظمت کے انکشاف کے ساتھ تم اللہ کا شکر ادا کرسکو۔

عظمتِ قرآن' بزبانِ قرآن

عظمت قرآن کا مضمون خود قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی خود تعریف کی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہم انسانوں کے لیے تو برائی کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہیں۔ جیسے تکبر بہت بڑی برائی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بڑائی کو اپنی چادر اور عظمت کو اپنی اِزار قرار دیا ہے: ((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِیْ)) (ابوداوٗد' ابن ماجہ' مسند احمد)۔ اُس کا نام اَلْمُتَكَبِّرُ ہے۔ یہ جامہ اُسی کو راست آتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی کسی بات کی تعریف کریں تو یہ اچھی بات محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے کلام کی عظمت بیان کرتا ہے اور خود اِس کی تعریف کرتا ہے۔ قرآن مجید کے وہ بے شمار مقامات جن میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی عظمت بیان کی ہے' ان میں سے پانچ مقامات میرے سامنے ایک عجیب ترتیب سے آئے ہیں' جسے میں نے بارہا بیان بھی کیا ہے۔ اس وقت وہ میرا اصل موضوع نہیں

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bissn-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 2 (1,1)

ہے' صرف انہیں گنوا دینا کافی ہے۔ پہلے ایک آیت' پھر دو آیتیں' پھر چار آیتیں' پھر چھ آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں' اور ہر مقام کا اپنا ایک خاص مضمون ہے۔

عظمتِ قرآن کی ایک تمثیل

عظمتِ قرآن فی نفسہٖ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن اللہ کی صفت ہے اور ہم اس کی عظمت کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن سورۃ الحشر میں فرمایا کہ ایک مثال سے ہم تمہیں کچھ تھوڑا سا تصور دے سکتے ہیں:

﴿لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾

''اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور وفکر کریں''۔

اور پہاڑ کے پھٹ جانے کا واقعہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت موسٰیؑ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ پردے کی اوٹ سے ﴿مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ہو رہا تھا۔ حضرت موسٰیؑ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے دیدار بھی حاصل ہو جائے۔ عرض کیا: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ﴾ ''پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔ فرمایا: ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ ''تم مجھے نہیں دیکھ سکتے'' ﴿وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ﴾ ''لیکن اس پہاڑ پر نظر جماؤ' (میں اس پر اپنی ایک تجلی ڈالوں گا) پس اگر وہ (اسے برداشت کر جائے اور) اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا﴾ (الاعراف: ۱۴۳) ''چنانچہ جب اُس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسٰیؑ غش کھا کر گر پڑے''۔ یہ بالواسطہ مشاہدہ تھا۔ حضرت موسٰیؑ نے پہاڑ پر اللہ کی تجلی کا مشاہدہ کیا' لیکن اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر

پڑے۔ اس سے ذرا عظمتِ قرآن کا اندازہ کیجیے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اور جو اللہ کی ذات کی تجلی کا اثر ہے وہی اللہ کی صفت کی تجلی کا اثر ہے۔

افادیتِ قرآن کے چار پہلو

سورۃ الحشر کی ایک آیت کے بعد اب سورۂ یونس کی دو آیتیں ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے' ایک ہے کسی شے کا اپنی جگہ عظیم ہونا اور ایک ہے اُس کی افادیت۔ تاج محل اپنی جگہ بڑا عظیم ہے' لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ ہوا؟ تو قرآن کی عظمت فی نفسہٖ کیا ہے' اس کا بیان تو سورۃ الحشر کی آیت میں آ گیا' جبکہ اس کی افادیت کیا ہے' اسے سورۂ یونس کی دو آیات میں بیان کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝﴾ (یونس)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ (آپؐ) کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے۔ وہ اس سے بدر جہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں''۔

یہ قرآن تمہارے ربّ کی طرف سے مَوْعِظَة یعنی نصیحت ہے' جس سے دل نرم ہو جائیں گے۔ جب دل نرم ہو جائیں گے تو یہ قرآن ان میں جذب ہو جائے گا' اس طرح ساری باطنی بیماریوں کا علاج ہو جائے گا۔ تکبر' حسد' حبّ دنیا' حبّ مال' حبّ جاہ اور حبّ شہرت کا علاج ہو جائے گا۔ پھر یہ ہدایت ہے۔ یہ تمہیں رستہ بتائے گا کہ تمہیں کدھر جانا ہے' کدھر نہیں جانا۔ اور آخرت میں رحمت ہے۔ یہ قرآن کی چار افادیتیں ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ قرآن اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کا مظہر ہے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ تو خوشیاں منانی ہوں تو اس کی مناؤ! اور جان لو کہ جو کچھ تم دنیا میں جمع

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bizan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 3 (1,1)

کرتے ہوئے ان سب چیزوں سے کہیں بڑھ کر قیمتی چیز یہ قرآن ہے۔

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات

آگے چلیے۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات ملاحظہ کیجیے۔ ان چار آیتوں میں چار چوٹی کی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝۱﴾ یہ اللہ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ہے۔ عرب اس نام سے واقف نہیں تھے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۶۰ میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟'' اللہ کو تو وہ جانتے تھے' اسم ''اللہ'' ان کے ہاں ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا' لیکن ''رحمٰن'' سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اللہ کی رحمت ہے اور ''رحمٰن'' میں وہ رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ظاہر ہوتی ہے' جس میں جوش اور ہیجان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سب سے پیارا نام رحمٰن ہے۔ آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲﴾ ''سکھلایا قرآن''۔ سارے علوم اللہ ہی نے سکھائے ہیں' چاہے مادّی علوم ہوں چاہے روحانی علوم ہوں' لیکن تمام علوم میں چوٹی کا علم قرآن کا علم ہے جو اللہ کی رحمانیت کا مظہر اتم ہے۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳﴾ ''پیدا کیا انسان کو''۔ اللہ تعالیٰ نے ہی تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ جنوں کو بھی اسی نے پیدا کیا' فرشتوں کو بھی اسی نے پیدا کیا۔ آسمان بنایا' زمین بنائی' پہاڑ بنائے' سورج' چاند' ستارے بنائے۔ کیا نہیں بنایا؟ لیکن جو کچھ اس نے بنایا ہے اس میں چوٹی کی مخلوق انسان ہے جو مسجودِ ملائک ہے' خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ آگے فرمایا: ﴿عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ۝۴﴾ ''اسے بیان کی صلاحیت دی''۔ تو کیا دیکھنے کی صلاحیت نہیں دی؟ سننے کی صلاحیت نہیں دی؟ ظاہر ہے انسان کو تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں' لیکن انسان کی سب سے اونچی صلاحیت قوتِ بیان ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔ تو ان چار آیات میں چوٹی کی چار چیزیں بیان کر دی گئیں۔

اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ جو سب سے اونچی صلاحیت ہے یعنی بیان' اس کو سب سے

اونچے علم ''قرآن'' پر صرف کرو۔ قرآن کو بیان کرو' قرآن کو عام کرو' قرآن کو پھیلاؤ۔ یہ نتیجہ حضورﷺ نے ایک حدیث میں بیان کر دیا: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) ''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور اسے سکھائیں''۔ خود قرآن پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ یہ قرآن کی اس نعمت کو عام کرنے کے لیے تشویق وترغیب کا انتہائی خوبصورت انداز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے پیارا نام ''رحمٰن'' —— اس نے جو علم انسان کو دیے اس میں چوٹی کا علم ''قرآن'' —— اس نے جو کچھ بنایا ہے اس میں چوٹی کی تخلیق ''انسان'' —— انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں چوٹی کی صلاحیت ''بیان''۔ تو جیسے ہم کہتے ہیں توپ سے مکھی نہیں ماری جاتی' توپیں کسی اور کام کے لیے بنتی ہیں' اسی طرح تم اس قوتِ بیان کو دنیاوی چیزوں کے لیے صرف نہ کرو۔ دنیا کی چیزوں کی اللہ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں۔ اسی قوتِ بیان کے زور پر ایک شخص عوامی مقرر اور لیڈر بن جاتا ہے' کوئی ڈکٹیٹر بن جاتا ہے' ہٹلر بن جاتا ہے' بھٹو بن جاتا ہے۔ اسی قوتِ بیان سے ایک وکیل ایک ایک پیشی کے پانچ پانچ لاکھ روپے لے لیتا ہے۔ حالانکہ وہی قانون ان وکیلوں نے بھی پڑھ رکھا ہوتا ہے جو بے چارے جوتیاں چٹخارتے پھر رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی اپنا وکیل نہیں کرتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ سرٹیفکیٹ attest کر کے تھوڑے سے پیسے کما لیتے ہیں۔ وہی قانون اے کے بروہی اور ایس ایم ظفر نے پڑھا ہے اور اپنی قوتِ بیان کے بل بوتے پر ایک مقام حاصل کیا ہے۔ تو اِس قوتِ بیان کا اصل مصرف یہ ہے کہ اسے قرآن کے لیے استعمال کیا جائے۔

کَلَّا اِنَّھَا تَذْکِرَۃ

سورۃ الرحمٰن کی چار آیات کے بعد اب ملاحظہ کیجیے سورۂ عبس کی چھ آیات۔ فرمایا:

﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾﴾

''یوں نہیں! یہ قرآن تو ایک نصیحت اور یاددہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاددہانی حاصل کرلے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو بہت پُرعظمت ہیں۔ بہت بلند مقام کے حامل' نہایت پاکیزہ ہیں۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو لائق تکریم اور پاک باز ہیں''۔

پہلی دو آیات میں فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ' یہ قرآن تذکرہ ہے' یاددہانی ہے۔ جو چاہے اس سے یاددہانی حاصل کرے۔ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ قرآن جس چیز کی طرف تمہیں بلا رہا ہے وہ تمہارے دل کے اندر موجود ہے۔ تم دنیا میں گم ہو گئے ہو اس لیے تمہیں پتا ہی نہیں کہ تمہارے پاس کتنا قیمتی ہیرا ہے۔ ہندی کا ایک بڑا پیارا دوہا ہے ؎

بھیکا بھوکا کوئی نہیں' سب کی گدڑی لال
گرہ کھول جانے نہیں اس بدیے کنگال

یعنی ''اے بھیک (شاعر کا نام) بھوکا اور محروم کوئی انسان بھی نہیں ہے' ہر انسان کی گدڑی کے اندر لعل موجود ہے' لیکن جو گرہ لگی ہوئی ہے وہ کھولی نہیں جاسکتی' اس لیے کنگال بن گئے ہیں۔'' پس تمہارے اندر تو سب کچھ ہے' لیکن ذہول ہے' توجہ نہیں ہے۔ یہ قرآن یاددہانی ہے۔ قرآن حکیم کے لیے خود قرآن میں الذّکر' ذکریٰ اور تذکرہ جیسے الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾﴾ (قٓ) ''پس آپ قرآن کے ذریعے اسے یاددہانی کرائیں جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ ایسے مقامات پر تعلیم کے بجائے تذکیر کا لفظ آتا ہے۔

اور یہ قرآن کتنی عظمت والا ہے؟ یہ لوحِ محفوظ میں ان صحیفوں میں درج ہے جو بہت محترم' باعزت اور پُرعظمت ہیں' بہت بلند مقام پر ہیں' نہایت پاک ہیں' ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو بہت ہی لائق تکریم اور پاک باز ہیں۔ یعنی یہ قرآن لوحِ محفوظ میں عالی مرتبت فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔

سورۃ الواقعہ کی آٹھ آیات

اس کے بعد سورۃ الواقعہ کی آٹھ آیات کا مطالعہ کر لیجیے:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾

''پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی' اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ بڑی عزت والا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے' جسے نہایت پاک مخلوق (فرشتوں) کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

ان آیات کا آغاز ایک بہت بڑی قسم سے ہوا۔ فرمایا: ''میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کے مقام کی۔ اور یہ قسم بہت بڑی ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا''۔ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ کتنی بڑی قسم ہے۔ یہ تو وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ چنانچہ آج نزولِ قرآن کے چودہ سو سال بعد ہمارے علم میں آیا ہے کہ اس کائنات میں بلیک ہولز ہیں' جو ستاروں کے سکڑ کر ختم ہو جانے کے نشانات ہیں۔ گویا ستارے ڈوب رہے ہیں' ان کی موت واقع ہو رہی ہے۔ کائنات میں کہیں ایک خلا پیدا ہوتا ہے۔ اس خلا کے اندر جو ویکیوم ہے اس میں کھینچنے کی اتنی طاقت ہے کہ جو ستارہ اس کے قریب سے گزر جائے اسے کھینچ کر اس قبر میں دفن کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ فرمایا اگر تم جانتے تو یہ بہت بڑی قسم ہے جو ہم نے کھائی ہے۔ اور یہ عظیم قسم اس بات پر کھائی جا رہی ہے کہ یقیناً یہ بہت باعزت قرآن ایک چھپی ہوئی محفوظ کتاب میں درج ہے' جسے کوئی چھو ہی نہیں سکتا' مگر نہایت پاک مخلوق یعنی فرشتے۔ یہ ربّ العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ لوحِ محفوظ سے اس کی تنزیل ہو رہی ہے محمد رسول

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bizan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 5 (1,1)

اللہﷺ پر۔ وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے جو یہ نازل ہو رہا ہے' یہ اللہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد ڈانٹ کا انداز ہے: ﴿اَفَبِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡهِنُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''پھر کیا اس کلام سے تم لاپرواہی برت رہے ہو؟'' اور سہل انگاری کر رہے ہو؟ تم نے انگریزی پڑھ لی' دنیا کی دوسری زبانیں سیکھ لیں' لیکن اتنی عربی نہیں پڑھی کہ ہمارے کلام کو سمجھ سکو۔ ڈاکٹری پڑھ لی اور اس میں بیس سال لگا دیے۔ انجینئرنگ میں اٹھارہ سال لگا دیے' لیکن اتنا وقت نہ نکال سکے کہ عربی پڑھتے اور قرآن کو براہِ راست اپنے قلب کے اندر اتارتے؟ ﴿وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّـكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''اور اپنا حصہ تم نے بس یہی رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے پھرو؟'' قرآن کے ساتھ تمہاری بے اعتنائی کا یہ طرزِ عمل اس کی تکذیب کے مترادف ہے۔ اگر تم اسے اللہ کا کلام مانتے تو یہ بے اعتنائی اور یہ بے توجہی ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں!

عظمتِ قرآن کے ضمن میں مَیں نے پانچ مقامات آپ کو گنوائے ہیں' جن کے درمیان بڑی حسین ترتیب بن گئی ہے ___ پہلے ایک آیت' پھر دو آیتیں' پھر چار آیتیں' پھر چھ آیتیں اور پھر آٹھ آیتیں۔ پہلی آیت میں اللہ کے کلام کی عظمت بیان ہوئی ہے جیسے کہ وہ ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن کی عظمت اس کے افادے کے لحاظ سے بیان ہوئی ہے۔ تیسرے مقام میں اس کو عام کرنے کی ترغیب و تشویق ہے۔ چوتھے مقام میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں تذکرہ اور یاد دہانی ہے' کوئی نئی شے نہیں ہے' تمہاری فطرت میں ہدایت موجود ہے' جسے وہاں سے یہ قرآن نکال کر تمہارے سامنے لاتا ہے۔ اور پھر پانچویں مقام پر فرمایا گیا کہ یہ کتابِ مکنون میں ثبت ہے' جہاں اسے کوئی چھو ہی نہیں سکتا سوائے فرشتوں کے جو نہایت پاک باز اور مطہر ہیں۔ اس آیت سے ضمنی طور پر یہ فقہی مسئلہ بھی نکالا گیا ہے کہ آپ قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتے اگر آپ باوضو نہ ہوں۔

﴿لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ کا ایک تیسرا مطلب بھی ہے۔ دیکھئے' ایک ہے اِس قرآن کا گودا اور مغز' جبکہ ایک اس کا چھلکا ہے۔ متذکرہ بالا الفاظِ قرآنی سے یہ

بات مستنبط ہوتی ہے کہ جن لوگوں کا اندر پاک نہیں ہو چکا‘ جن لوگوں کا تزکیۂ نفس نہیں ہو چکا‘ وہ اس کے چھلکے ہی کے ساتھ کھیلتے رہیں گے‘ اس کے مغز تک اُن کی رسائی نہیں ہو گی‘ چاہے وہ کہنے کو مفسر بن جائیں‘ جلدیں کی جلدیں لکھ دیں۔ غلام احمد پرویز نے ’’مفہوم القرآن‘‘ لکھ دی‘ غلام احمد قادیانی آنجہانی کے بیٹے نے تفسیر کبیر بھی لکھی تفسیر صغیر بھی‘ لیکن قرآن کے مغز تک اِن حضرات کی رسائی نہیں ہوئی۔ مولانا روم نے یہ بات اپنے ایک شعر میں بیان کی ہے‘ اگرچہ انداز اچھا نہیں ہے‘ لیکن بہت گہری بات کہی ہے ۔

ما ز قرآں مغزہا برداشتیم
اُستخواں پیشِ سگاں انداختیم

یعنی ہم نے قرآن سے اس کا مغز حاصل کر لیا ہے‘ ہڈی کا گودا تو ہم نے لے لیا ہے اور جو ہڈی تھی وہ کتوں کے آگے ڈال دی ہے۔ تو انسان قرآن کے مغز تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کا باطن پاک نہ ہو۔

عظمتِ قرآن‘ احادیثِ نبویؐ کے آئینے میں

میری آج کی گفتگو کا موضوع ’’عظمتِ قرآن بلسانِ نبوت‘‘ ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی عظمت کو کس طرح بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث تو میں بیان کر چکا ہوں:

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))
’’تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے‘‘۔
یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح بخاری کی ہے۔

دوسری حدیث جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور مسلم شریف کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms17-11 azmat-e-quran bisan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 6 (1,1)

’’اللہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے سے کچھ قوموں کو بامِ عروج تک پہنچائے گا اور اسی کو ترک کرنے کے باعث کچھ کو ذلیل وخوار کردے گا‘‘۔

اس حدیث کو جس قدر اہمیت علامہ اقبال نے دی ہے میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں دی۔ اس حدیث کا مفہوم اقبال اپنے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تھے اور دنیا پر چھا گئے تھے‘ اور تم اسی قرآن کو چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہو گئے ہو! اور اسی مضمون کو علامہ نے فارسی میں کس قدر خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی!

کہ اے اُمت مسلمہ! تو قرآن کو ترک کرنے کے باعث ذلیل وخوار ہوئی ہے‘ لیکن تو گردشِ دوراں کا شکوہ کر رہی ہے اور اپنے زوال کا سبب ’’فلک کج رفتار‘‘ کو قرار دے رہی ہے‘ حالانکہ فلک تو کسی قوم کی قسمت نہیں بدلتا۔ اپنی ذلت و رسوائی کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

اے وہ اُمت جو شبنم کی طرح زمین پر پامال پڑی ہوئی ہے اور لوگ تجھے اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں‘ اگر اب بھی تم بلندی چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہاری بغل میں ایک زندہ کتاب (قرآن مجید) موجود ہے۔

فتنوں سے بچاؤ کا راستہ

اب جو حدیث میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ کلامِ نبوت کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کلام کی فصاحت یہ ہوتی ہے کہ کلام واضح ہو‘ سمجھ میں

آ جائے‘ اس میں کوئی ایچ پیچ نہ ہو‘ پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہ ہو۔ کلام کی بلاغت یہ ہے کہ وہ قلب و ذہن تک پہنچ جائے‘ ذہن اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور عذوبت سے مراد کلام کی مٹھاس اور شیرینی ہے۔ تو فصاحت‘ بلاغت اور عذوبت‘ ان تینوں اعتبارات سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مجموعے میں اس حدیث کا بہت اونچا مقام ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ’’حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا‘‘: ((اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)) ’’عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہو گا‘‘۔ آنحضور ﷺ نے جس فتنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں رونما ہوا۔ یہ فتنہ ایک بدمعاش یہودی عبداللہ بن سبا کا اٹھایا ہوا تھا‘ جس میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ اس کے بعد مسلسل چار سال تک جنگ ہوتی رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا دورِ خلافت خانہ جنگی اور فتنے کی نذر ہو گیا۔ جنگ جمل‘ جنگ صفین اور جنگ نہروان میں تقریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں‘ نیزوں اور تیروں سے قتل ہوئے۔ اس کے علاوہ اسلام جو پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا تھا‘ اس کی نشأۃِ اولیٰ کا سیلاب کسی کے روکے نہ رکتا تھا — ؏ ’’تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا‘‘ — وہ سیلِ رواں اندر کے فتنے اور خانہ جنگی نے روک دیا اور یہ معاملہ رجعتِ قہقری کا شکار ہو گیا۔ اس پر ایک مصری مصنف نے ’’الفتنۃ الکبریٰ‘‘ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عظیم ترین فتنہ ہے جو تاریخِ اسلامی میں ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی خبر اِن الفاظ میں دی: ((اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)).

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قُلْتُ: مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ ’’میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہو گا‘‘؟ ’’مَخْرَج‘‘ نکلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بڑے بڑے ہالز میں باہر نکلنے کے راستوں پر سرخ لائٹ کے ساتھ ’’EXIT‘‘ لکھا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bizan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 7 (1,1)

کوئی دھماکہ ہو جائے یا آگ لگ جائے یا کوئی اور ایمرجنسی کی صورت پیش آ جائے تو ہال میں موجود لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے ان راستوں کی طرف بھاگیں۔ عرب ممالک میں EXIT کی جگہ ''مَخرَج'' لکھا ہوتا ہے۔ لسانِ نبوتؐ سے فتنے کی خبر سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے بچاؤ کے لیے مَخرَج کا پوچھا کہ اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟ اس میں جو بات میرے اور آپ کے لیے قابل غور ہے وہ ہمارے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کا بنیادی فرق ہے۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو پوچھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ فتنہ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کب آئے گا؟ کدھر سے آئے گا؟ کیوں آئے گا؟ حالانکہ ان سب سوالات کا عملی فائدہ کیا ہے؟ یہ تو سب معلومات ہیں۔ حضرت علیؓ نے بڑا عملی سوال پوچھا کہ اس سے بچ نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو جواب ارشاد فرمایا اس پر توجہ کیجیے۔ قَالَ: ((کِتَابُ اللّٰہِ)) آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب!'' فتنوں سے نکالنے والی شے اللہ کی کتاب ہوگی!

جنگ صفین میں جب حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی تجویز کے تحت قرآن نیزے پر اٹھا دیا گیا کہ لڑنے جھگڑنے کا فائدہ نہیں ہے' یہ قرآن ہمارے مابین فیصلہ کرے گا' تو حضرت علیؓ جنگ بندی پر تیار ہو گئے۔ حالانکہ آپؓ کے ساتھیوں میں سے بڑی تعداد نے کہا کہ علیؓ دھوکہ کھا گئے۔ بلکہ خوارج نے تو (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر اور واجب القتل قرار دے دیا —— لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن کو حَکَم کیسے نہ مانتے؟ انہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔ میاں بیوی میں چپقلش اِس حد تک بڑھ جائے کہ تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ: ﴿فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا﴾ (النساء: ۳۵) یعنی ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک حَکَم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کیا جائے۔ چنانچہ حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں نے اپنی اپنی جانب سے ایک ایک حَکَم مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو حَکَم مقرر کیا۔ بعض لوگ اسے حضرت

علیؓ کی سیاسی غلطی کہتے ہیں لیکن حضرت علیؓ کے پیشِ نظر یہ حدیث ہو گی کہ فتنے سے نکلنے کا راستہ قرآن ہے۔

قرآن: ماضی‘ حال اور مستقبل کا آئینہ

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی مدح جس انداز میں بیان فرمائی ہے یہ کلامِ نبویؐ کی فصاحت و بلاغت اور عذوبت کی بہترین مثال ہے۔ فرمایا: ((فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ)) ’’اس قرآن میں خبریں ہیں ان کی جو تم سے پہلے گزر گئے (یعنی قومِ نوح‘ قومِ عاد‘ قومِ ثمود‘ قومِ شعیبؑ‘ آلِ فرعون) اور اس میں خبر ہے تم سے بعد والوں کی بھی‘ اور تمہارے مابین جو اختلافات ہو جائیں ان کا فیصلہ بھی اس کے اندر ہے‘‘۔ ((وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ)) کے حوالے سے میں قرآن مجید کے تین مقامات سے دس آیتیں بارہا بیان کر چکا ہوں جو آج کے پاکستان کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ قرآن میں پاکستان کا ذکر موجود ہے۔ پاکستان کیسے بنا‘ اس کا بھی ذکر ہے۔ پھر پاکستان حاصل کر کے ہم نے بحیثیت قوم کیا وطیرہ اختیار کیا‘ اس کا بھی ذکر ہے‘ اور اب اس کا کیسا انجام ہونے والا ہے‘ اس کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ الانبیاء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے‘ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟‘‘

فیصلہ کن کتاب

آگے فرمایا: ((هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ)) ’’یہ قرآن ایک فیصلہ کن کتاب ہے‘ یاوہ گوئی نہیں ہے‘‘۔ یہ شاعروں کی شاعری نہیں ہے۔ یہ تو قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے کرنے والی کتاب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کے مطابق اب قوموں کی تقدیر کے فیصلے اس قرآن سے ہوں گے۔ اگر کوئی قوم ابھرے گی تو قرآن لے کر ابھرے گی اور گرے گی تو قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے گرے گی۔ یہاں آپ کسی مغالطے کا شکار نہ ہو جائیں‘ مغرب (West) ابھرا ہے تو وہ بھی قرآن کی وجہ سے ابھرا

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bisan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 8 (1,1)

ہے۔ نوٹ کر لیجیے‘ اقبال نے یہ کہا ہے:

"The inner core of the Western Civilization is Quranic."

’’مغربی تہذیب کا باطن قرآنی ہے۔‘‘

قرآن نے انسان کو توہمات سے نجات دلائی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ آنکھوں سے کام لو‘ کانوں سے کام لو‘ دیکھو‘ مشاہدہ کرو۔

کھول آنکھ‘ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ بات مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں اور مغربی مفکرین بھی کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم کرنے والی اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر تھی۔ اسی سے گتھیوں پر گتھیاں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی رہی تھیں‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلجھتی کم‘ الجھتی زیادہ تھیں۔ اسلام نے آ کر انسان کو منطق کی اس تنگ نائے سے نکالا اور اسے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ نے تمہیں سماعت دی ہے تاکہ سنو‘ بصارت دی ہے تاکہ دیکھو‘ تمہیں تفکر و تعقل کی استعداد دی ہے تاکہ غور و فکر اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط‘ استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ یہ روحِ عصر ہے اور اس روحِ عصر کا آغاز کرنے والا قرآن ہے۔ یورپ نے اسی کو اختیار کیا اور وہ بامِ عروج پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس میں انہوں نے بہت سی ٹھوکریں بھی کھائی ہیں‘ وہ ایک علیحدہ مضمون ہے‘ لیکن مغربی تہذیب کے باطن (inner core) کے بارے میں علامہ کہتے ہیں کہ یہ قرآنی ہے۔ البتہ اس کے ظاہر کے بارے میں اقبال نے ’’The dazzling exterior‘‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ یہ بڑی چکاچوند کا حامل ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ہمارے نوجوان یورپ اور امریکہ میں جا کر اسی ظاہری چکاچوند سے مبہوت ہو جاتے ہیں' لیکن علامہ کہتے ہیں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز وحولِ قدس!

اس شعر کے دوسرے مصرع میں مَیں نے کچھ لفظی تصرف کیا ہے۔ بہرحال قرآن کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا کہ ''یہ ایک فیصلہ کن کتاب ہے' یاوہ گوئی نہیں ہے''۔ سورۃ الطارق میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ﴿۱۴﴾﴾ ''بے شک یہ قرآن دوٹوک فیصلہ کرنے والا کلام ہے' یہ ہنسی کی اور بے فائدہ بات نہیں ہے''۔ یہی بات رسول اللہﷺ نے اس حدیث مبارک میں ارشاد فرمائی۔

حدیث کے اگلے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے فصاحت' بلاغت اور عذوبت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں کس قدر رغنائیت ہے۔ فرمایا: ((مَنۡ تَرَكَهٗ مِنۡ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ)) ''جو شخص اپنے تکبر کی وجہ سے اس قرآن کو ترک کر دے گا اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا''۔ اگرچہ قرآن کو ترک ہم نے بھی کیا ہے لیکن تکبر کی وجہ سے نہیں' بلکہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کیا ہے۔ قرآن ترک کرنے کے مجرم تو ہم بھی ہیں' لیکن ہم نے قرآن کے خلاف تکبر نہیں کیا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جو کوئی جابر و سرکش اپنی سرکشی کے قہر اور جوش میں آ کر اور طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر قرآن کو ترک کرے گا اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا۔

ہدایت کا سرچشمہ

((وَمَنِ ابۡتَغَی الۡهُدٰی فِیۡ غَیۡرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) ''اور جو کوئی قرآن کے سوا کسی اور شے میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا''۔ فلسفہ سے آپ ہدایت لینا چاہتے ہیں تو لازماً ناکام ہوں گے۔ مولانا ظفر علی خان کا شعر آپ کو یاد ہو گا۔

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دُکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bisan-e-nabowat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 9 (1,1)

اور علامہ اقبال مشرق و مغرب کے فلسفے کھنگال چکنے کے بعد کس کرب سے کہتے ہیں۔

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب

وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فلسفہ تو کھجور کا ایسا بانجھ درخت ہے جس پر کھجور لگتی ہی نہیں' لہٰذا مجھے اس سے کچھ نہیں ملا۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!

تو ثابت ہوا کہ فلسفہ ہدایت کا ذریعہ نہیں ہے۔ اسی طرح سائنس بھی ذریعۂ ہدایت نہیں ہے۔ سائنس تو آلات ایجاد کرنے کا ذریعہ ہے۔ سائنس تو توانائی کے سرچشمے تلاش کرنے اور قدرتی طاقتوں کو دریافت کرنے کا ذریعہ ہے۔ توانائی (energy) کا سب سے پہلا ذریعہ جو انسان نے دریافت کیا وہ آگ ہے' اور وہ اتفاقاً انسان کے علم میں آ گئی ہو گی۔ ہزاروں سال قبل کسی انسان نے دیکھا کہ ایک چٹان اوپر سے گری' نیچے بھی چٹان تھی' دونوں کے ٹکرانے سے شعلہ نکلا۔ اب اس نے اس مشاہدے کی بنیاد پر خود تجربہ کیا اور دو پتھر لے کر خوب زور سے ٹکرائے تو شعلہ نکل آیا۔ لیجیے آگ ایجاد ہو گئی۔ اس سے پہلے انسان کچا گوشت کھاتا تھا' اس کے علاوہ پھل کھاتا تھا' درختوں کی جڑیں کھاتا تھا۔ آگ کی دریافت کے بعد انسان نے گوشت کو بھون کر اور پکا کر کھانا شروع کر دیا۔ اسے اوّلین سورس آف انرجی مل گئی۔ پھر کسی سائنس دان نے دیکھا کہ ایک ہانڈی چولہے کے اوپر چڑھی ہوئی ہے اور اس کا ڈھکنا ہل رہا ہے۔ اس نے سوچا اس کو کون ہلا رہا ہے؟ کیا کوئی جن بھوت ہے؟ معلوم ہوا کہ اندر بھاپ (steam) پیدا ہو رہی ہے اور بھاپ میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ اسے ہلا رہی ہے۔ اس طرح توانائی کا ایک ذریعہ بھاپ دریافت ہو گئی اور اس سے بڑا کام لیا گیا۔ کبھی سٹیم کے انجن چلتے تھے' جو بڑے ہیبت ناک اور دیوہیکل ہوا کرتے تھے۔ فرنٹیئر میل کا انجن دیکھ کر خوف آتا تھا۔ انسانی قد سے زیادہ تو اس کے پہیے کا گھیرا تھا۔ یہ سٹیم سے چلتے تھے۔ پھر بجلی ایجاد ہو گئی۔

تو سائنس سے ہدایت نہیں ملتی۔ اس سے تو آپ کو کچھ چیزوں کے استعمال کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ ہدایت صرف قرآن سے ملے گی۔ حضورﷺ نے فرمایا جو کوئی قرآن کے سوا کہیں اور سے ہدایت ڈھونڈے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا۔

اللہ کی مضبوط رسّی

آگے پھر حدیث کے تین ٹکڑے فصاحت و بلاغت اور عذوبت و غنائیت کی بہترین مثال ہیں۔ فرمایا: ((وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ ، وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ ، وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ)) شاعری نہیں ہے' لیکن آزاد شاعری سے ملتا جلتا انداز ہے۔ ((وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہی ہے اللہ کی مضبوط رسّی''۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص﴾ ''اللہ کی رسّی کو مل جل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں مت پڑو''۔ لیکن وہ اللہ کی رسّی کون سی ہے؟ اسے قرآن میں واضح نہیں کیا گیا' بلکہ اس کی صراحت حدیث سے ہوتی ہے۔ حدیث سے ناواقف لوگ ایسی آیات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس ہو رہی تھی تو جگہ جگہ اس آیت کے بینر لگے ہوئے تھے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص﴾. ہر رکشا اور ٹیکسی پر بھی یہی آیت لکھی ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں اپنی ایک کتاب کی طباعت کے سلسلے میں مکتبہ جدید پریس گیا تو وہاں آزاد کشمیر حکومت کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ آئے ہوئے تھے جو کمیونسٹ تھے۔ انہوں نے بڑی دریدہ دہنی سے کہا کہ یہ کیا مہمل کلام ہے؟ کہاں ہے اللہ کی رسّی جسے مل کر تھامنا ہے؟ کہاں لٹکی ہوئی ہے وہ رسّی؟ دکھاؤ مجھے! یہ اصل میں حدیث سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں اگر کوئی شے تشریح طلب ہو تو اُس کو واضح کرنا حضورﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ منکرینِ حدیث تو حضورﷺ کا یہ حق بھی تسلیم نہیں کرتے' جبکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ آپؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾(النحل:۴۴) ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن حکیم) نازل کیا تاکہ آپ واضح کر دیں اس کو

لوگوں کے لیے جواُن کی طرف نازل کیا گیا ہے''۔تو آپؐ نے واضح فرمادیا کہ:((وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔اس کو پکڑلو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ کِتَابُ اللّٰہِ)) (مسلم)

''اور میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑلو گے تواس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے' وہ کتاب اللہ ہے''۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((کِتَابُ اللّٰہِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) (الترمذی)

''اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا) جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسّی ہے''۔

اس ضمن میں ایک اور حدیث بڑی ہی پیاری ہے۔حضور ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے' دیکھا کہ مسجد کے ایک کونے میں کچھ لوگ بیٹھے قرآن مجید کا مذاکرہ کررہے ہیں' سمجھ رہے ہیں' سمجھا رہے ہیں' تو آپؐ کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار ظاہر ہوئے' آپؐ ان کے پاس تشریف لائے اور پوچھا:((اَلَسْتُمْ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَھٰذَا الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟)) ''کیا آپ لوگ اس کے گواہ نہیں ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں' اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' سب صحابہؓ نے کہا:((بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ)) ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول!'' ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔اب آپ ﷺ نے فرمایا:((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے''۔

قرآن: پُرحکمت ذکر

زیر مطالعہ حدیث میں آگے فرمایا: ((وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ)) ''اور یہی پُرحکمت

ذکر ہے''۔ قرآن اپنے آپ کو ''الذکر'' کہتا ہے' لیکن تم نے ذکر کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ سب سے مضبوط اور مستحکم ذکر یہ قرآن ہے' لیکن اس پر توجہ ہی نہیں' جبکہ ذکر واذکار اور اوراد و وظائف کے مجموعے توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

دعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (ترمذی) یعنی ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ بلکہ یہاں تک فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (ترمذی) یعنی ''دعا ہی تو عبادت ہے''۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِیْ وَمَسْاَلَتِیْ اَعْطَیْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ)) ''جو شخص قرآن کی (تلاوت اور درس و تدریس کی) مصروفیت کی وجہ سے میرا ذکر نہ کر سکے اور مجھ سے دعا نہ کر سکے میں اُسے اس شے سے افضل عطا کرتا ہوں جو میں دعا کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں''۔ اس حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ)) (ترمذی) ''اور اللہ کے کلام کو جملہ کلاموں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر''۔

قرآن: صراطِ مستقیم

زیر مطالعہ حدیث کے اگلے الفاظ ہیں: ((وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ)) ''اور یہی صراطِ مستقیم ہے''۔ نماز کی ہر رکعت میں ہم ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اس حدیث میں صراحت آ گئی کہ صراطِ مستقیم یہی قرآن ہے۔

((هُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ)) ''یہ وہ شے ہے جس کے ہوتے ہوئے خواہشاتِ نفس (تمہیں) گمراہ نہیں کر سکیں گی''۔ اس قرآن سے رابطہ ہو گا تو خواہشاتِ نفسانی ٹیڑھے رُخ پر نہیں لے جا سکیں گی۔

((وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ)) ''اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکیں گی''۔ اس کے ساتھ سابقہ آسمانی کتابوں والا معاملہ کرنا ممکن نہیں ہو گا کہ ذرا سا زبان کو مروڑ کر

پڑھا تو کچھ کا کچھ بن گیا۔اس طرح اُن کتابوں میں تحریف ہوگئی۔قرآن حکیم میں اس طرح کی تحریف کے سارے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے جو لفظ ''رَاعِنَا'' استعمال ہو رہا تھا' مسلمانوں کو اس سے بھی روک دیا گیا۔رَاعِنَا کا مطلب ہے ذرا ہماری رعایت کیجیے' ہمارا لحاظ کیجیے' میں آپ کی بات سمجھا نہیں ہوں' آپ دوبارہ سمجھا دیجیے۔ لیکن یہود نے اسے زبان مروڑ کر ''رَاعِيْنَا'' کہنا شروع کر دیا تو اس لفظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کو توڑ مروڑ کر کہیں کا کہیں پہنچایا جا سکے۔قرآن اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔قرآن میں ہے: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ ''اس پر باطل حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔''

بے مثل و بے مثال کتاب

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکیں گے''۔ سیر ہونا کس کو کہتے ہیں؟ آپ نے کھانا اتنا کھا لیا کہ پیٹ بھر گیا اور آپ سیر ہو گئے۔اب آپ کے سامنے کوئی بہترین ڈش بھی لے آئے اور تھوڑا سا کھانے کی فرمائش کرے تو آپ کی طبیعت آمادہ نہیں ہوگی' اس لیے کہ آپ سیر ہو چکے ہیں۔لیکن قرآن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوں گے۔اس پر غور کرتے رہیں' تدبر کرتے رہیں' پڑھتے رہیں' لیکن قرآن سے سیر نہیں ہوں گے۔یہ اس کا اعجاز ہے۔

((وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ)) ''اور تکرارِ تلاوت سے اس پر کوئی باسی پن طاری نہیں ہوگا''۔دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے۔آپ نے کوئی کتاب ایک دفعہ پڑھی تو اب دوسری دفعہ پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا۔اور اگر دوسری دفعہ پڑھ لی تو اب اسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہے گا۔لیکن یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اسے پڑھتے رہیے' پڑھتے رہیے' سینکڑوں دفعہ پڑھ جائیے' ہر دفعہ آپ کوئی چیزیں ملیں گی' نئے نئے نکتے ملیں گے۔امام شافعیؒ اصولِ فقہ کے امام تھے۔ان کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فقہ کے چار مآخذ قرآن' سنت' اجماع اور قیاس کے لیے قرآن سے دلائل جمع کر رہے تھے' لیکن

اجماع کے لیے انہیں قرآن سے کوئی دلیل نہیں مل رہی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے تین سو مرتبہ شروع سے آخر تک قرآن پڑھا' لیکن دلیل نہیں ملی۔ اس کے بعد جب تین سو ایک مرتبہ پڑھ رہے تھے تو سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ کے ان الفاظ پر توجہ مرتکز ہوگئی: ﴿......وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ‌ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۝۱۱۵﴾ ''......اور جو کوئی مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے' اور وہ بدترین جائے قرار ہے''۔ مسلمانوں کا راستہ وہ ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا ہے: ((اِنَّ اُمَّتِیۡ لَا تَجۡتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ)) (ابن ماجہ) ''یقیناً میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی''۔

جواہر علم وحکمت کا لامتناہی خزانہ

((وَلَا تَنۡقَضِیۡ عَجَائِبُهٗ)) ''اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے''۔ یہ وہ کان ہے جس میں سے علم وحکمت کے گوہر نایاب ہمیشہ نکلتے رہیں گے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ حدیث مبارک کا یہ ٹکڑا بہت اہم ہے۔ ہم نے عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن کی تفسیر وتشریح میں جو کچھ اسلاف لکھ گئے' وہ حرفِ آخر ہے۔ یہ تصور غلط ہے' کیونکہ قرآن اتنا محدود نہیں ہے۔ ہیروں کی ایک کان سے آپ ہیرے نکالتے رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ معلوم ہوگا کان خالی ہوگئی۔ لیکن قرآن ایسی کان نہیں ہے جو کبھی خالی ہو جائے۔ اس میں سے ہیرے نکلتے رہیں گے۔ اس میں غور وفکر اور تدبر کے نتیجے میں علم وحکمت کے موتی ہمیشہ نکلتے رہیں گے۔ بقول اقبال ؎

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم

خاص طور پر جدید سائنس جیسے جیسے ترقی کرے گی' قرآن میں سے نئے نئے ہیرے نکلتے چلے آئیں گے۔ سورۃ حٰم السجدۃ کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ‌ؕ﴾ ''ہم عنقریب اپنی نشانیاں

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms17-11 azmat-e-quran bizan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 12 (1,1)

لوگوں کو دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے اندر بھی' یہاں تک کہ یہ بات بالکل مبرہن ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے''۔ چنانچہ آج کے سائنس دان انگشت بدنداں ہیں کہ چودہ سو برس پہلے یہ بات قرآن نے کہی ہے جو ہم پر آج کھلی ہے' جبکہ نہ مائیکروسکوپ کا وجود تھا' نہ dissection کا معاملہ تھا اور ماں کے پیٹ میں جنین کی نشوونما کے تمام مراحل قرآن نے کس قدر صراحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ البتہ جہاں تک فقہی وشرعی احکام کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ پیچھے کی طرف چلیں۔ اسلاف کی بات سنیں' پھر اُن کے بھی اسلاف کی بات سنیں۔ فقہائے متأخرین کا نقطۂ نظر معلوم کر لیا ہے تو متقدمین کا نقطۂ نظر معلوم کریں۔ ان سے بھی پیچھے جائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچ جائیں۔ ان سے بھی پیچھے جائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں سر رکھ دیں۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

''اپنے آپ کو محمد مصطفی ﷺ کے قدموں تک پہنچا دو' کیونکہ دین تو نام ہی ان کا ہے۔ اگر وہاں تک نہیں پہنچو گے تو یہ سراسر بولہبی ہی ہے۔''

جنات کا قبولِ اسلام

((ھُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَہِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْہُ حَتّٰی قَالُوْا : ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ﴾ ''یہ وہ کتاب ہے کہ اسے جیسے ہی جنوں نے سنا' فوراً پکار اٹھے: ہم نے ایک بہت خوبصورت قرآن سنا ہے جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے' تو ہم اس پر ایمان لے آئے''۔ ہمارا حال یہ ہے کہ سینکڑوں مرتبہ سنتے ہیں مگر ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا' جیسے چکنے گھڑے کے اوپر سے پانی بہہ جائے۔ اور جنوں کی جماعت نے اسے ایک مرتبہ سنا تو وہ اس پر ایمان لے آئی۔ اس واقعہ کا ذکر سورۃ الجن کے آغاز میں ہے۔ جبکہ سورۃ الاحقاف میں بتایا گیا ہے کہ یہ جنات ایمان لانے کے بعد اپنی قوم کے پاس گئے تو جاتے ہی دعوت وتبلیغ کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو

بتایا کہ "ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور رشد و ہدایت کی طرف"۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کو رسول اللہ ﷺ کی پکار پر ایمان لانے کی دعوت دی: ﴿یٰقَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ......﴾ "اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ......"

حدیث کا کلائمکس

حدیث کے آخری ٹکڑے اس حدیث کا کلائمکس ہیں۔ فرمایا: ((مَنْ قَالَ بِہٖ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِہٖ اُجِرَ، وَمَنْ حَکَمَ بِہٖ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا اِلَیْہِ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ)) "جس نے قرآن کی بنیاد پر بات کہی اُس نے سچ کہا' اور جس نے قرآن پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے' اور جس نے قرآن کی بنیاد پر کوئی فیصلہ دیا اس نے عدل کیا اور جس نے قرآن کی طرف بلایا اُسے تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دی گئی"۔ کسی اور کو ہدایت حاصل ہو یا نہ ہو' یہ داعی کے ذمے نہیں ہے' البتہ جو قرآن کی طرف بلا رہا ہے اس کی ہدایت یقینی (ensured) ہے۔

دعوت الی القرآن کا مدّعا

اب جان لیجیے کہ دعوت الی القرآن کا مطلب کیا ہے۔ لوگوں سے یہ کہنا کہ قرآن پڑھو اور پھر انہیں قرآن پڑھانا' لوگوں کو دعوت دینا کہ قرآن سمجھو اور پھر انہیں سمجھانا دعوت الی القرآن ہے۔ دعوت الی القرآن کا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی قرآن پر عمل کرو اور اجتماعی زندگی میں بھی اسے ایک نظام کی حیثیت سے قائم کرو۔ یہ بھی دعوت الی القرآن ہے کہ اس قرآن کو پہنچاؤ دنیا کے ایک ایک انسان تک۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کو پوری نوعِ انسانی کے لیے بھیجا گیا تھا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ؐ نے کہہ دیا تھا کہ دیکھو میں نے تمہیں پہنچا دیا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ) "اب جو موجود ہیں وہ ان کو پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma17-11 azmat-e-quran bizan-e-nabovat.inp 8/22/2014 3:33 PM PAGE 13 (1,1)

مشن کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ہم مدینے کی گلیوں کی بات کرتے ہیں' مدینے میں دفن ہونے کی آرزو کرتے ہیں' لیکن وہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر نکلے۔ ان میں سے کوئی فارس میں دفن ہے تو کوئی عراق میں۔ کوئی شام میں ہے تو کوئی مصر میں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ حضورﷺ کے میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن ہیں۔ اس لیے کہ اُن حضرات کے پیش نظر دین کو پھیلانا تھا۔

یہ حدیث امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے اپنی اپنی سنن میں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''شعب الایمان'' میں نقل کی ہے۔ مزید برآں مسند احمد اور معجم کبیر طبرانی میں یہ مختلف انداز میں آئی ہے۔ حدیث کا آغاز اس طور سے ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ علیہ السلام فَقَالَ : یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اُمَّتَکَ مُخْتَلِفَةٌ بَعْدَکَ)) ''میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمدﷺ! آپ کی اُمت آپ کے بعد اختلاف کا شکار ہو جائے گی''۔ ((قَالَ فَقُلْتُ : فَاَیْنَ الْمَخْرَجُ یَا جِبْرِیْلُ؟)) ''آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دریافت کیا: اے جبرائیل! تو (اس اختلاف سے) نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟'' ((قَالَ فَقَالَ: کِتَابُ اللّٰہِ تَعَالٰی......)) ''آپؐ نے فرمایا کہ جبرائیلؑ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب......'' اس روایت کی رو سے اس حدیث کے راویٔ اوّل حضرت جبرائیل علیہ السلام' راویٔ ثانی محمد رسول اللہﷺ اور راویٔ ثالث حضرت علیؓ ہیں۔

عظمتِ قرآن کے موضوع پر یہ عظیم حدیث میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ آپ اس حدیث کا متن اور ترجمہ اپنے پاس محفوظ کر لیں' بلکہ لیمینیشن کرا کے نمایاں جگہ پر لٹکا لیں اور کوشش کریں کہ یہ آپ کو یاد ہو جائے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(قارئین میثاق کی سہولت کے پیش نظر حدیث کا متن اور ترجمہ ٹائٹل کے اندرونی صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

تفہیم دین

اسلام اور حرمتِ رِبا

حافظ محمد آصف احسان عبدالباقی

ہر طرح کی حمد و ثنائے سرمدی اُس ذات بے مثل ہی کو زیبا ہے جس کی رحمت کی اتھاہ گہرائیوں اور فضل کی وسعتوں میں کائنات کا وجود معدوم و نامعلوم ہے' اور فضائے بسیط میں محوِ گردش اَن گنت ستاروں کی مانند لاتعداد درود و سلام رشد و ہدایت کے اس تابندہ و ضوافشاں ماہِ کامل پر جن کے اُسوۂ حسنہ کی اتباع ہی میں دُنیوی اور اُخروی فوز و فلاح کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دین اسلام میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلقہ جن امور کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے' ان میں من حیث المجموع تمام افراد معاشرہ کے لیے بے شمار نقصانات پنہاں ہیں۔ اگرچہ ظاہری اعتبار اور عمومی تأثر سے کوئی منع کردہ یا حرام شے کتنی ہی مفید اور دل پذیر کیوں نہ معلوم ہو' اس کے نتیجے میں انسانی معاشرے پر مرتب ہونے والے ضرر رساں اثرات بہرحال اس کے فوائد سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال شراب اور جوا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''(اے نبیؐ!) لوگ آپؐ سے شراب اور جوئے کے متعلق استفسار کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں بڑے نقصانات ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں' مگر ان کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔''

رِبا کا شمار بھی انہی اُمور میں ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بصراحت حرام قرار دیا ہے۔ رِبا کے لغوی معنی ''بڑھنے اور زیادہ ہونے'' کے ہیں[۱] جبکہ اصطلاحی طور پر ادھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رِبا ہے۔[۲] اردو اور فارسی زبان میں اس کا اصطلاحی ترجمہ ''سود'' کیا جاتا ہے۔[۳] سود کی حرمت اسلام کے ان احکام میں سے ایک ہے جن میں کوئی اختلاف نہیں'

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\msll-11 islam avr hurmat ribaa.inp 8/22/2014 3:31 PM PAGE 1 (1,1)

جملہ اہل اسلام حرمتِ سود پر متفق ہیں‘(۴) اور اس اجماعِ اُمت کی اساس قرآن وحدیث کی مندرجہ ذیل نصوص پر ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵)

’’(باہمی) لین دین کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام‘‘۔

اور فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾﴾ (البقرۃ)

’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے‘ اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے۔ (اس میں) نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔‘‘

اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((دِرْهَمُ رِبًا يَّاْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلٰثِيْنَ زَنْيَةً)) (۵)

’’سود کا ایک درہم یہ جاننے کے باوجود کھانا کہ یہ سود ہے‘ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔‘‘

اور فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ)) (۶)

’’سود کے ستر درجے ہیں اور ان میں سب سے ادنیٰ درجہ اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرنے کے مترادف ہے۔‘‘

اس کے علاوہ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ)) (۷)

’’رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے‘ سود دینے والے‘ سودی لین دین لکھنے والے اور اس کے گواہوں سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ (گناہ میں) یہ سب برابر ہیں‘‘۔

اس حدیث مبارک سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صرف سود کھانے والا ہی ملعون

نہیں، بلکہ سود دینے والا اور کھلانے والا بھی ملعون ہے۔ اس کے باوجود عوام الناس کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اسلامی شریعت میں صرف سود لینا ہی حرام ہے، دینا نہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم میں صرف سود خور ہی کی مذمت بیان کی گئی ہے (البقرۃ: ۲۷۵) اور سود دینے والے کا کوئی تذکرہ نہیں، چنانچہ سود لینا تو حرام ہے جبکہ سود دینا حرام تو درکنار، محض گناہ بھی نہیں۔ اس نظریۂ باطلہ کا ابطال نقل و عقل کی رو سے حسب ذیل ہے، وباللہ التوفیق۔

نقلی طور پر اس طرح کہ جملہ اہل اسلام کا یہ اجتماعی موقف ہے کہ قرآن پاک کے اوّلین شارع نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ ہیں، آپؐ سے بہتر قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کوئی اور بشر نہیں کر سکتا اور یہ منصب جلیل آپ ﷺ کو خالق کائنات ہی کی جانب سے ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ (النحل)

''اور ہم نے آپؐ پر یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لیے نازل کیا گیا ہے اسے بیان کر دیں اور شاید کہ وہ تفکر و تدبر کریں''۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کے مقدس فرامین تک رسائی کا ذریعہ کون سا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اقوال و افعال اور اعمال و عادات سے باخبر ہونے کا ذریعہ احادیث مبارکہ ہیں اور اس بات پر بھی اجماع اُمت ہے کہ احادیث مبارکہ شرعی طور پر حجت ہیں۔ اب جو لوگ ان کی حجت شرعیہ کے منکر ہیں اور خیر خواہی اور تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر دین میں من مانی تأویلات اور تحکمانہ آراء کو رواج دینے میں مصروف ہیں تو ایسے شیاطین من الانس والجن کے بدعقیدہ و گمراہ ہونے میں ہمیں کوئی تردّد نہیں۔ پس اگرچہ قرآن حکیم میں سود کھانے والے ہی کی مذمت بیان کی گئی ہے، تاہم احادیثِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے سود کھلانے والے کو بھی ملعون قرار دیا ہے۔

عقلی اعتبار سے اس امر کی تصریح یوں کی جا سکتی ہے کہ عمومی طور پر اللہ کی معصیت و نافرمانی میں دو کردار ملوث ہوتے ہیں، ایک گناہ کا ارتکاب کرنے والا اور دوسرا اس کا محرک بننے والا یا اس کے لیے اسباب و ذرائع فراہم کرنے والا۔ چنانچہ یہ دین اسلام کا خاصہ ہے کہ وہ جہاں اہل اسلام کو ارتکابِ گناہ سے بچنے کی تلقین کرتا ہے وہاں اس امر کو بھی ان کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سلسلے میں کسی سے کوئی تعاون نہ کریں۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\msll-11 islam avr hurmat ribaa.inp 8/22/2014 3:31 PM PAGE 2 (1,1)

چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠﴾ (المائدۃ:۲)

’’گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت و نصرت نہ کرو‘‘۔

اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ سود خور تو فعل حرام کا مرتکب ہو‘ اس کے خلاف اللہ اور اس کے رسولﷺ کی جانب سے اعلانِ جنگ بھی ہو اور سود کھلانے یا دینے والے پر کوئی وبال ہی نہ ہو۔ سورۃ المائدۃ کی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں تو سود دینے والا بھی برابر کا مجرم ہے۔ اس بات کی مزید توضیح اس طرح سے بھی کی جاسکتی ہے کہ اسلام میں زنا کرنا حرام ہے اور اس فعل بد کے مرتکب افراد پر حد جاری ہوتی ہے‘ جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اب زنا کے حرام ہونے کی بنا پر اس کے لیے اسباب و ذرائع کی فراہمی بدرجۂ اولیٰ حرام ٹھہری۔ اگر کوئی شخص خود تو زنا کا ارتکاب نہ کرے مگر اس کے لیے اسباب مہیا کرنا شروع کر دے‘ جیسے عصمت فروش عورتوں کا کاروبار وغیرہ‘ اور دلیل دے کہ اسلام میں زنا کرنا حرام ہے‘ قحبہ گری حرام نہیں تو کیا اس دلیل کی روشنی (بلکہ تیرگی) میں قحبہ گری کا جواز ثابت ہو جائے گا؟ نسأل اللّٰہ السلامۃ و العافیۃ۔

پھر اس امر کو بیان کرنا بھی از بس ضروری ہے کہ اسلام میں کئی دیگر امور کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے‘ جیسے شرک‘ بدکاری اور چوری وغیرہ‘ لیکن قرآن و حدیث کی نصوص میں جس قدر شدت سود کے بارے میں اختیار کی گئی ہے‘ جیسا کہ سطور بالا سے عیاں ہے‘ کسی اور گناہ کے بارے میں اتنی شدت روا نہیں رکھی گئی۔ امام قرطبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص امام مالک بن انسؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے ابوعبداللہ! میں نے شراب کے نشے میں دھت ایک شخص کو دیکھا جو مدہوشی میں چاند کو پکڑنا چاہتا تھا تو میں نے کہا کہ انسان کے پیٹ میں جو کچھ داخل ہوتا ہے اگر ان میں شراب سے زیادہ کوئی بری چیز موجود ہو تو میری بیوی کو طلاق ہے۔ اب کیا میری بیوی کو طلاق ہو گئی؟ (یعنی انسان کے پیٹ میں داخل ہونے والی جملہ اشیاء میں سب سے زیادہ بری شے شراب ہے یا اس سے زیادہ بھی کوئی بری شے موجود ہے؟) امام مالکؒ نے اس سے کہا: ’’تو لوٹ جا‘ تاکہ میں تیرے مسئلے میں غور و تدبر کروں‘‘۔ اگلے روز وہ شخص پھر امام صاحبؒ کے پاس آیا تو آپؒ نے اسے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ وہ شخص آیا تو پھر امام مالکؒ نے اس سے فرمایا: ’’تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے‘ کیونکہ میں نے اللہ کی کتاب اور اس کے نبیﷺ کی سنت میں تدبر و تفکر کیا تو مجھے سب سے زیادہ بری (اَشرّ) شے رِبا

(سود) معلوم ہوئی جسے انسان اپنے پیٹ میں لے کر جاتا ہے''۔[۸]

رِبا کی حرمت کے متعلق قرآن وحدیث سے مستنبط نصوص کا یہ ایک اجمالی ساخاکہ ہے' وگرنہ اس باب میں احادیث و آثار کا ایک معتد بہ حصہ روایت کیا گیا ہے[۹]۔ پھر سود کی حرمت صرف اسلام ہی کا طرۂ امتیاز نہیں' بلکہ یہودیت ونصرانیت میں بھی اس کی ممانعت کے احکام موجود ہیں۔ چنانچہ عہد نامۂ قدیم میں ہے:

''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو' کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا''۔[۱۰]

اور عہد نامۂ جدید میں ہے:

''جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر۔''[۱۱]

حرمتِ سود کی حکمت

شریعت اسلامیہ میں بعض امور کی ادائیگی کو لازم قرار دیا گیا ہے' انہیں اوامر کہتے ہیں' اور بعض امور سے احتراز کرنے کا حکم دیا گیا ہے' انہیں نواہی کہتے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے ہدایت کردہ اوامر ونواہی میں جملہ انسانیت کے لیے بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں مخفی ہیں جن سے تفصیلی آگاہی وواقفیت کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی گرانقدر اور وقیع کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی کتاب ''اسلام میں حلال و حرام'' (اردو ترجمہ) اہم اور فائدہ مند ہیں۔ اگر ہم محرمات کی علل (reasons) پر تدبرو تفکر کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض معاصی ایسے ہیں جن کے صرف اخلاقی وروحانی نقصانات ہیں' بعض کے معاشرتی وتمدنی اور بعض کے اقتصادی ومعاشی۔ گویا کہ ناجائز امور و محرمات کی اکثریت انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کے لیے ہی نقصان دہ اور ضرر رساں ہوتی ہے اور بعض کے لیے نہیں' جبکہ سود کا بلا شک وشبہ یہ مابہ الامتیاز (hallmark) ہے کہ اس میں اخلاقی وروحانی' معاشرتی وتمدنی اور اقتصادی ومعاشی ہر طرح کے نقصانات بدرجۂ اَتم موجود ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:[۱۲]

اخلاقی وروحانی نقصانات

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق وروحانیت انسانیت کا جوہر عظیم ہیں۔ کسی بھی فرد کے معاشرتی مقام ومرتبہ کی تعیین (determination) میں اس کے اخلاقی وروحانی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\msll-11 islam avr hurmat ribaa.inp 8/22/2014 3:31 PM PAGE 3 (1,1)

کردار کو انتہائی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی پاک ﷺ نے مختلف احادیث مبارکہ میں اچھے اخلاق اختیار کرنے کی بہت تاکید وتلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

((اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا)) (۱۳)

''جملہ مؤمنوں میں ایمان کے اعتبار سے کامل ترین وہ ہیں جو اچھے اخلاق کے حامل ہیں۔''

اب اگر کوئی قول وفعل یا عمل وعادت اچھے اخلاق وکردار کے منافی ہو تو بہر حال وہ ترک کیے جانے کے لائق ہے۔ اخلاق وروحانیت کے مقرر کردہ پیمانوں کو مدنظر رکھ کر اگر سودی ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سودخوری سے انسان میں خودغرضی' بخل' تنگ دلی' سنگدلی اور زرپرستی جیسی غیر اخلاقی صفات پیدا ہوتی ہیں جو بتدریج اس کے اندر نمو پاتی رہتی ہیں' جس کے نتیجے میں اس کے دل کے اندر موجود خیر و بھلائی اور احسان وتعاون کے فطری احساسات وجذبات معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سود کھانے والے کا واحد ہدف اور مشغلہ ارتکازِ دولت ہوتا ہے جس کے لیے وہ ہر جائز وناجائز طریقے کو بروئے کار لاتا ہے' خواہ مقروض کاروباری طور پر دیوالیہ ہو جائے' اس کا گھر بک جائے' مال واسباب لٹ جائیں' وہ اور اس کے اہل خانہ بھوکے مرنے پر مجبور ہو جائیں' سودخور کو ہر حال میں اپنے طے کردہ منافع ہی سے غرض ہوتی ہے۔ غور کیجیے! جو شقی القلب انسان انفرادی سطح پر ایسا ظلم وستم روا رکھ سکتا ہے' اجتماعی طور پر پورے معاشرے کی اخلاقی اقدار کے لیے اس کا وجود کس قدر ہلاکت خیز اور تباہ کن ثابت ہوگا!

معاشرتی وتمدنی نقصانات

انسان معاشرتی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد جب باہم ملتے ہیں تو معاشرہ کہلاتے ہیں۔ انسانی معاشرہ کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں تمام لوگوں کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جب سودخوری کے نتیجے میں خودغرضی اور باہمی لاتعلقی جیسی ننگ انسانیت صفات جنم لیتی ہیں تو معاشرہ اندرونی طور پر عدم استحکام اور پراگندگی وخلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ سودخور طبقہ اپنی اغراض کو تمام امور پر مقدم گردانتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نادار طبقہ کا بدترین طریقے سے استحصال کرتا ہے۔ جس معاشرے میں طبقاتی تفاوت کی خلیج اس قدر وسیع ہو جائے کہ ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ٹھہرے' ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لیے نفع اندوزی کا ذریعہ ثابت ہو اور اہل ثروت

کا مفاد نکبت و افلاس کی چکی میں پسے ہوئے لوگوں کے مفاد کی ضد ہو جائے تو اچھے یا برے معاشرے کی بحث سے قطع نظر ایسا معاشرہ تو مجرد معاشرہ کہلائے جانے کے بھی لائق نہیں۔

اقتصادی و معاشی نقصانات

اقتصادیات میں بصیرت رکھنے والے اصحاب سے یہ امر مخفی نہیں کہ تجارت وزراعت اور دوسرے کسی بھی نفع بخش (lucrative) کام کی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس سے منسلک جملہ افراد اپنے کام کے نفع و نقصان سے غایت درجہ دلچسپی رکھتے ہوں' جہاں کاروبار سے حاصل ہونے والے فوائد و ثمرات میں سب یکساں طور پر شریک ہوں وہاں اس کا نقصان بھی سب کا نقصان تصور کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سب افراد کاروبار کو مزید نفع بخش اور سود مند بنانے کے لیے اجتماعی طور پر تگ و تاز کرتے ہیں' اور ان اسباب و علل کے دفعیہ کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جو کاروبار میں کسی بھی طرح کے خسارے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس نظریہ کا اگر معیشت کے نفسیاتی پہلو سے بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بلاشک و شبہ یہ ایسی حکمت عملی ہے جو جلب منفعت اور حصولِ ترقی کے اعتبار سے موزوں ترین قرار دی جا سکتی ہے۔ اب سودی لین دین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ سود خور کو مقروض کی تجارت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا' مقروض کو کاروباری طور پر نفع ہو یا نقصان' سود لینے والے کو تو اپنے طے شدہ منافع ہی سے غرض ہوتی ہے' بلکہ بسا اوقات سودی قرض دینے والا شخص مقروض کے کاروبار میں خسارے کی تمنا کرنے لگ جاتا ہے تاکہ امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے سود میں اضافہ ہوتا جائے۔ ایسی سنگدلانہ سوچ اور غیر انسانی ذہنیت من حیث المجموع پورے معاشرے کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے' اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

سطور بالا میں بیان کردہ حقائق سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر انسانیت پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ اقوام عالم کی تیرہ بختی و سوختہ نصیبی کی انتہا ہے کہ عصر حاضر میں ان کے اقتصادی و معاشی نظام کی عمارت کا بیشتر حصہ سودی نظامِ معیشت پر استوار ہے' جدید بینکاری نظام تو مکمل طور پر سودی لین دین ہی پر مشتمل ہے۔ ایک حدیث پاک میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى اَحَدٌ اِلَّا اٰكَلَ الرِّبَا فَاِنْ لَّمْ يَاْكُلْهُ اَصَابَهُ مِنْ بُخَارِهٖ)) (۱۴)

E:\Ma-2005\Meesaaq_PAF_2005\meesaq december2005\mall-11 islam aur hurmat ribaa.inp 8/22/2014 3:31 PM PAGE 4 (1,1)

’’لوگوں پر ایک دور ایسا آئے گا کہ کوئی بھی سود کھائے بغیر نہ رہے گا‘ اور اگر نہیں کھائے گا تو سود کا دھواں اس کو ضرور پہنچے گا۔‘‘

جس معاشرے میں ہم آج من حیث القوم زندگی بسر کر رہے ہیں‘ اگر ہم اس کے مجموعی تناظر میں اپنی حالت کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ مندرجہ بالا حدیث مبارک ہم پر سو فیصد منطبق ہوتی ہے۔ یہ حد درجہ تأسف انگیز صورت حال ہے۔ سود‘ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا‘ ایسا گناہ نہیں کہ جسے حقیر سمجھ کر یا معمولی جان کر لاپرواہی سے نظرانداز کر دیا جائے‘ یہ تو خالق کائنات اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو کسی بھی ذریعے سے سودی لین دین میں ملوث ہوتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ! یہ کتنی خوفناک تنبیہہ اور دل دہلا دینے والی دھمکی ہے‘ اللہ کی پناہ!! یہ ایسی جنگ ہے کہ جس کا انجام متعین اور نتیجہ معلوم ہے۔

سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر باہمی لین دین کی جتنی صورتیں بھی رائج ہیں کیا انہیں اسی طرح رہنے دیا جائے یا ان کے جواز وعدم جواز کی تحقیق بھی کی جائے؟ پھر اقتصادیات سے متعلقہ بعض امور کے غیر شرعی و ناجائز ہونے کا فتویٰ دے بھی دیا جائے تو پھر بھی ہم اپنی ذمہ داری سے کماحقہ‘ عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک عالم دین کا فرض صرف یہی نہیں کہ وہ کسی چیز کو تحقیق و تفتیش کے بعد ناجائز کہہ دے‘ بلکہ یہ بات بھی اس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ اور فہم و لیاقت کے مطابق اس کے شرعی حل اور متبادل سے بھی عوام الناس کو آگاہ کرے۔ سورۂ یوسف کی مندرجہ ذیل آیات اس نکتے کی بطریق احسن توضیح کرتی ہیں:

﴿وَقَالَ الْمَلِکُ اِنِّیْٓ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْکُلُھُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ط یٰٓاَیُّھَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ کُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ج وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْھُمَا وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمْ بِتَاْوِیْلِہٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْکُلُھُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ لا لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ج فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْہُ فِیْ سُنْبُلِہٖٓ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْکُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْکُلْنَ

مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور سات خشک۔ اے سردارو! اگر تم خوابوں کی تعبیر جانتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔ انہوں نے کہا یہ تو پراگندہ خواب ہیں اور ہم ان کی تعبیر سے بے خبر ہیں۔ اب وہ شخص جو دونوں قیدیوں میں سے رہائی پا گیا تھا اور جسے مدت کے بعد وہ بات یاد آ گئی' بول پڑا کہ میں آپ کو اس کی تعبیر سے آگاہ کرتا ہوں' مجھے (جیل خانے) بھیج دیجیے۔ (غرض وہ یوسفؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا) یوسفؑ! اے بڑے سچے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیں کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور سات سوکھے' تاکہ میں لوگوں کے پاس جاؤں (اور خواب کی تعبیر بتاؤں اور) شاید وہ (آپ کی قدر) جانیں۔ انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے' تو جو غلہ کاٹو تو تھوڑے سے غلے کے سوا جو کھانے میں استعمال ہو' باقی کو خوشوں ہی میں رہنے دینا۔ پھر اس کے بعد خشک سالی کے سات سال آئیں گے کہ جو غلہ تم نے ان کے لیے جمع کر رکھا ہو گا وہ اس سب کو کھا جائیں گے' سوائے اس تھوڑے سے کے جو تم روک رکھتے ہو۔''

جیسا کہ معلوم ہوا' حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے کارندے کو خواب کی تعبیر بعد میں بتائی' پہلے اس سے بچنے کا طریقہ بیان کر دیا۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن وحدیث کی روشنی میں جدید معاشی نظریات کا بغور جائزہ لیں اور صرف ان کے عدم جواز کا فتویٰ دے دینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ ان کے شرعی حل سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کریں۔ واللّٰہ ھو الموفق۔

حواشی

۱) لسان العرب' ج۵' ص ۱۲۶ بذیل مادہ۔ المفردات فی غریب القرآن' ص۱۸۶ بذیل مادہ اور لغات الحدیث از علامہ وحید الزمان' ج ۲' ص ۲۷ بذیل مادہ۔

۲) معارف القرآن از مفتی محمد شفیع صاحب' ج۱' ص ۶۶۵۔ **مزید تفصیل کے لیے رجوع کریں:** کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ از عبدالرحمن الجزیری' ج۲' ص ۲۴۵ **اور مظاہر حق جدید** شرح مشکوٰۃ' ج۳' ص ۶۴۔ **واضح رہے کہ رِبا کی اساسی طور پر دو اقسام ہیں:** ربا النسیئۃ **اور** ربا الفضل۔ **ان دونوں کی تعریف اور کیفیت ونوعیت میں فرق ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں' تاہم مزید وضاحت کے لیے دیکھئے:** کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ'

ج۲' ص ۲٤٥ تا ۲٤٨ **اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۱۰' مقالہ : ربوٰ۔**

۳) مظاهر حق جدید' ج۳' ص ٦٤۔

٤) کتاب المجموع شرح المهذب للامام نووی رحمه الله 'ج۹' ص ٤٨٧۔وشرح صحیح مسلم للامام نوویؒ ج۷' ص ٤٣٠٣۔والمغنی لابن قدامه المقدسی' ج٤' ص ۳۔

٥) مسند امام احمد بن حنبل۔ **رجال صحیح ہیں' دیکھئے :** تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ' ج۲' ص ١٦٣۔

٦) سنن ابن ماجه' کتاب التجارات' باب التغلیظ فی الربا۔ **اس حدیث کو امام بیہقیؒ اور ابن جریرؒ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔اس کی اسناد میں نجیح بن عبدالرحمٰن ابومعشر ضعیف ہے۔تاہم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مرفوع روایت ''سود کے تہتر (۷۳) دروازے ہیں اور ان میں سے آسان ترین اپنی ماں سے نکاح کرنا ہے'' سے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت امام حاکمؒ نے بیان کی ہے اور اس کی تصحیح کی ہے۔دیکھئے:** نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار' ج٥' ص ٢٠١۔وتنقیح الرواۃ 'ج۲' ص ١٦٣۔

۷) صحیح مسلم' کتاب المساقاۃ مع النوویؒ' باب لعن آکل الربا ومؤکله۔

۸) الجامع لاحکام القرآن للامام القرطبیؒ ج۲' ص ۲۳٥۔

۹) **تفصیل کے لیے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب: اسلام اور سودی نظام' ص۴۳ تا ۶۱۔**

۱۰) کتاب الخروج ' باب ۲۲' فقرہ ۲٥۔

۱۱) لوقا کی انجیل' باب٦' فقرہ ۳۰۔

۱۲) **زیر نظر مقالہ میں اختصار و ایجاز کو بطور خاص مدّ نظر رکھا گیا ہے' لہٰذا حرمت رِبا کی حکمت و مصلحت کے ضمن میں بیان ہونے والے نقصانات بھی مختصر ہیں' ان کی جملہ تفصیل کے لیے دیکھئے :** سبل السلام شرح بلوغ المرام للامیر الصنعانیؒ ' ج۳' ص ٦۹' ۷۰ **اور راقم الحروف کی کتاب: اسلام اور سودی نظام' ص۸۱۔**

۱۳) جامع الترمذی' ابواب الرضاع' باب ما جاء فی حق المرأۃ علی زوجها۔ وکنز العمال فی سنن الاقوال والافعال' ج۳' ح ٥١٣٠' ٥١٣١' ٥١٧٩' ٥٢٠٢' ٥٢٠٣۔

۱٤) **اس حدیث کو امام احمدؒ' ابوداوٗدؒ' نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔صاحب** "عون المعبود" **نے اس کی سند کو منقطع قرار دیا ہے** (عون المعبود' ج۳' ص ۲٤۹) **اور شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے(دیکھئے:**مشکوٰۃ ۲۸۱۸' ضعیف سنن ابن ماجه ۲۲۷۸' ضعیف سنن ابی داوٗد ۳۳۳۱ و ضعیف سنن النسائی ٤٤٥٥) **جبکہ صاحب** "تنقیح الرواۃ" **نے حسنؒ کے ابو ہریرہؓ سے سماع ثابت ہونے کی صورت میں حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (ج ۲' ص ۱۶۲) اور آخر میں لکھا ہے کہ:** فسماعة من ابی هریرة لیس ببعید (ایضاً)۔

درجواب آں غزل

کیا اسرائیل کو تسلیم کیا جائے؟

(''صوت الحق'' کی صوتِ ناحق کے جواب میں)

تحریر: گل رحمان ہمدرد☆

اکتوبر ۲۰۰۵ء کا ماہنامہ ''صوت الحق'' کراچی نظر سے گزرا۔ اس کے اداریے میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے ''عقل ناقص'' کو استعمال کرتے ہوئے دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک ''انکشاف'' تو انہوں نے یہ کیا ہے کہ ''بیت المقدس کبھی بھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں رہا، نہ اوّل، نہ ثانی اور نہ ثالث''۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہا ہے یا نہیں رہا اس پر ہم اپنے اگلے کسی مضمون میں تفصیلی بحث کریں گے، لیکن اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے جن دلیلوں کا سہارا لیا گیا ہے اور تسلیم نہ کرنے کی صورت میں جن خدشات وخطرات کا ذکر کیا گیا ہے، ان پر ایک ناقدانہ جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

صاحبِ اداریہ بڑے فخریہ انداز سے لکھتے ہیں:

> ''حکومت آج اسرائیل سے ہاتھ ملا رہی ہے۔ صوت الحق نے پہلی بار اُس وقت اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کی تھی جب مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں نے چند اسرائیلی گوریلے پکڑے تھے...... انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ اُن کا مشن ہے کہ اس راستے سے جا کر پاکستان کا کہوٹہ پلانٹ تباہ کر دیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ اسرائیل کو تسلیم کر لو تاکہ دنیا میں ہمارا ایک ہی دشمن رہے...... مگر ہمارا اکلوتا دشمن بھارت عربوں کا جگری دوست ہے......''

اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ تعلقات جوڑنے کے خواہش مند ''صاحب اداریہ'' سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۰ پر مشتمل اللہ کے اِس دوٹوک ازلی حکم، اِس واضح اور ابدی

☆ متعلم بی اے (فائنل ایئر) قرآن کالج لاہور

09-11a

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms09-11a.inp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 1 (1,1)

فیصلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ جس میں کہا گیا ہے کہ ''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ تم صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بنایا ہے' وگرنہ اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے' تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے''۔ اب اگر فاضل اداریہ نگار خدا کے اس فیصلے کے علی الرغم یہود و نصاریٰ کو راضی کرنا چاہتے ہیں تو گویا وہ ہاتھی کے کان میں سوئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''اسرائیل کو تسلیم کر لو...... مگر ہمارا اکلوتا دشمن بھارت عربوں کا جگری دوست ہے'' تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت ہی غریب وضعیف اور حدیثِ بے خبراں ہے۔ جو لوگ تاریخ کا تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربوں نے ہر کڑے وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ۱۹۴۸ء' ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں مسئلہ کشمیر کے باعث پاکستان کو مجبوراً ہندوستان کے ساتھ جنگیں لڑنا پڑیں۔ ان جنگوں کے دوران عرب ممالک (سوائے عراق کے) نے اعلانیہ طور پر پاکستان کی سفارتی' اخلاقی اور مالی مدد کی۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد عربوں نے اُس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جب تک خود پاکستان نے ایسا کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ آج عرب ممالک میں پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد تلاشِ معاش کے سلسلے میں مقیم ہے۔ لہٰذا یہ ''قوالی'' گانا کہ عرب ممالک ہم سے زیادہ بھارت کو پسند کرتے ہیں' صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال اس روایت کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو اِس کے جواب میں اور ''قصاص'' کے طور پر اسرائیل کو تسلیم کرنا اسلام کا کون سا اصول ہے؟ کیا اسلام یہ پیغام دیتا ہے کہ حق بات صرف اُس وقت تک کہتے رہو جب تک اس سے کوئی دنیاوی مفاد حاصل ہوتا رہے؟ کیا اسرائیل کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ ہے؟ کیا ہماری قومی غیرت وحمیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں؟ ذرا اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ تمہارا تعلق اس قوم سے ہے جس کی قومیت کا انحصار وطنیت پر نہیں بلکہ حرفِ لا الٰہ الا اللہ پر ہے۔ نادانو! تمہارا تعلق اس قوم سے ہے جس کے سپوتوں نے ''ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست'' کا نعرہ لگاتے ہوئے سندھ اور اندلس کے ساحلوں پر اذانیں دیں۔ تمہیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ صرف چند سکّوں اور دنیاوی فوائد کی خاطر حق کو چھپاتے پھرو۔ ع
''کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے!''

دامِ دنیا میں گرفتار صاحبِ اداریہ نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی دلیل قرآن کو تاویل

سے پاژند بنا کر تراشی ہے۔سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۱۳‘۱۱۴ کا حوالہ دیتے ہیں:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾

’’ان میں سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم الٰہی پر) قائم بھی ہیں جو رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نیکیوں کی طرف لپکتے ہیں۔یہی لوگ نیکوکار ہیں۔‘‘(ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری)

تو گویا اسرائیل میں آباد یہودی اس آیت کی رو سے بڑے ہی نیکوکار ہیں! رات کو اللہ کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں اور بھلائی کے کاموں کا حکم دیتے ہیں! یہ الگ بات ہے کہ دنیا کی ساری جنگیں اور قتل وغارت گری یہود کرواتے ہیں۔تو گویا یہود زہد وتقویٰ‘ خلوص وللّٰہیت‘ صبر واستقلال‘ ہمت وعزیمت‘ وسعتِ قلب اور عالی ظرفی کے پیکر ہیں‘ لہٰذا ان سے تعلقات بنانا اور اسرائیل کو تسلیم کرنا ہمارا قومی ہی نہیں بلکہ مذہبی اور اخلاقی ’’فرض‘‘ بھی ہے......!!

صاحبِ اداریہ نے دلیل کے طور پر یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہﷺ نے یہود کے ساتھ میثاقِ مدینہ بھی کیا تھا۔تو اس سلسلے میں ہم ان کے فکر کی اصلاح کے لیے اتنا ہی عرض کریں گے کہ رسول اللہﷺ نے جن یہودیوں کے ساتھ میثاقِ مدینہ کیا تھا انہوں نے مسلمانوں کو اپنے وطن سے نہیں نکالا تھا‘ جبکہ اسرائیل کے یہودیوں نے مسلمانوں کو اپنے وطن سے نکالا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ کیا یہودیوں نے اُس معاہدے کی پاسداری کی تھی؟ نہیں۔تو جس قوم نے آپ کے رسولؐ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہو تو اُس قوم سے آپ یہ توقع کیسے رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی پاسداری کریں گے؟ یہی وہ قوم تھی کہ میثاقِ مدینہ کے بعد جب تک مدینے کی پرامن اسلامی ریاست کے حلیف رہے مسلسل سازشوں کے جال بنتے رہے۔اُن کی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزیاں یہاں تک بڑھ گئیں کہ عرب کی ساری مشرک اقوام کو غزوۂ خندق میں مدینے پر چڑھا

E:\Ma-2005\Meesaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ma09-11a.inp 9/22/2014 3:30 PM PAGE 2

لائے تھے۔ کیا تاریخ کی یہ عبرتیں سبق حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ﴾ (آل عمران:٦٤)

”ان اہل کتاب سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو بات یکساں مشترکہ تسلیم کی گئی ہے آؤ اس پر بات کریں“۔

اب اس کا مسئلۂ فلسطین کے ساتھ کیا تعلق ہے اور فلسطین کے حوالے سے ہم میں اور اہلِ کتاب میں کون سی بات مشترک ہے؟ یہ ”راز“ ہم اپنی کم علمی کے باعث ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔

”یار جہاں“ مزید لکھتے ہیں کہ ”اللہ کا فرمان ہے: ﴿لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ﴾ (بنی اسرائیل:٧٠) ”میں نے تمام بنی آدم کو واجب تکریم (عزت کے قابل) پیدا کیا ہے“ تو اس میں تمام بنی آدم بلاتفریق مذہب آ جاتے ہیں“۔ گویا علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی روح بول رہی ہے۔ مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا﴾ (آیت ۸۲) ”تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے تم قوم یہود کو پاؤ گے اور ان لوگوں کو جو شرک کرتے ہیں“۔

محض عقل کو ہی زمانے میں مشعل راہ سمجھنے والے یہ اداریہ نگار مزید لکھتے ہیں: ”اگر ہم اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو اسرائیل ہماری تباہی میں بھارت کا ساتھ نہیں دے گا‘ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی بھی تو ہم اس کے سفیر مقیم اسلام آباد کو بلا کر باز پُرس تو کر سکیں گے“۔

جناب! اگر ایسا ہی ہے تو ۱۹۷۱ء میں آپ نے روس کے سفیر کو بلا کر باز پُرس کیوں نہیں کی؟ جبکہ روس ہماری تباہی میں اعلانیہ بھارت کا ساتھ دے رہا تھا۔ پاکستان اگر اسرائیل سے دوستی کر لے تو ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جن مسلمان ملکوں نے پاکستان سے پہلے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے ان کو کیا ملا ہے؟ ترکی نے سب سے پہلے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے کون سے فوائد حاصل کیے ہیں؟ ترکی کو مکمل سیکولر ریاست بننے کے باوجود صرف کلمہ گوئی کی سزا کے طور پر یورپی یونین میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ مصر نے بھی اسرائیل سے دوستی کی ہے۔ اس کے فوائد کی فہرست کون سی ہے؟ اردن بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بعد خالی دامن لیے اب تک انتظار میں ہے۔

مادیت کا بے پیراہن لباس زیب تن کیے ہوئے صاحب اداریہ لکھتے ہیں: ”کیا

اسرائیل بھارت سے بھی زیادہ قابل نفرت اور مضر ہے؟'' افسوس صد افسوس' کتنا سادہ سا اور معصومانہ سوال کر بیٹھے ہیں۔ اسرائیل ہمارے لیے قابل نفرت اور مضر ہے یا نہیں' اس کا اندازہ اسرائیل کے ایک یہودی سکالر بن گوریان کے اس مضمون کے چند جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ''جیوش کرانیکل'' کے ۱۹/اگست ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ وہ لکھتا ہے:

''اب عالمی صہیونی تحریک کا اوّلین ہدف پاکستان ہونا چاہیے' کیونکہ یہ نظریاتی ریاست اسرائیل کی سلامتی کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ اس کا ہر باشندہ عربوں سے لگاؤ رکھتا ہے اور یہودیوں سے نفرت کرتا ہے' اس لیے پاکستان کے لیے فوری اقدامات بہت ضروری ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں بسنے والوں کی اکثریت ہندوؤں کی ہے جن کے دلوں میں صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور نفرت بھری ہوئی ہے' اس لیے ہندوستان ہمارے لیے اہم ترین اڈہ ہے جہاں سے ہم پاکستان کے خلاف کارروائی کر سکیں گے۔''

میرا خیال ہے مضمون نگار کی آنکھیں کھولنے کے لیے بن گوریان کے یہی جملے کافی ہیں۔

آگے جا کر فاضل مضمون نگار کا مضمون ایک عجیب تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے بروز جمعہ ۲ ستمبر ۲۰۰۵ کو یومِ احتجاج منایا اور کہا کہ اسرائیل کو بھلا ہم کیسے تسلیم کریں' اس نے ہمارے مسلمانوں کے وطن پر قبضہ جما رکھا ہے' اور مسلمانوں کو ان کے وطن سے نکالا ہے۔'' ذرا آگے جا کر لکھتے ہیں: ''دوسری بات یہ ہے کہ ہر عرب اپنے اپنے بیت کو مقدس سمجھتا ہے اور اس کی بازیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ پاکستانی جب بھی بات کرتے ہیں یہ بیت المقدس کا ذکر کرتے ہیں' اُن کے بیت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ بھی فلسطینیوں کو ناپسند ہے''۔

تو جناب آپ خود بتائیں کہ قاضی حسین احمد صاحب کے اس جملے کا کیا مطلب ہے جو بقول آپ کے انہوں نے کہا کہ اسرائیل نے ہمارے مسلمانوں کے وطن پر قبضہ جما رکھا ہے' اور مسلمانوں کو ان کے وطن سے نکالا ہے۔ کیا وطن سے نکالنا کوئی اور چیز ہے اور گھروں سے نکالنا کوئی اور چیز ہے؟ کیا وطن سے نکالے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ گھروں سے نکالے گئے ہیں؟

ہمارے ''نادان'' زعمائے ملت اور ''کم علم'' اور ''ناسمجھ'' علماء کے بارے میں یہ حضرت

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms09-11a.inp 9/22/2014 3:30 PM PAGE 3

یوں رقم طراز ہیں: ’’یہ ہیں بے چارے ہمارے زعماء اور ان کا مبلغ علم‘ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ فلسطینی مہاجرین میں ثلث سے زیادہ تعداد عیسائیوں کی ہے‘‘۔

صاحب اداریہ کو اپنی ’’صوتِ ناحق‘‘ بلند کرتے ہوئے مہاجرین کے اعداد و شمار میں زبردست غلطی لگی ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ فلسطین پر برطانوی قبضے کے وقت وہاں کی کل آبادی سات لاکھ تھی جس میں پونے چھ لاکھ عرب مسلمان‘ ۲۰ ہزار عیسائی اور صرف پچاس ہزار یہودی تھے۔ استعماری طاقتوں نے دنیا کے مختلف خطوں سے یہودیوں کو لا کر وہاں آباد کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب اس علاقے میں برطانیہ نے اپنی فوجیں نکالیں تو آبادی کا تناسب یکسر تبدیل ہو چکا تھا اور یہودیوں کی تعداد ۵۰ ہزار سے بڑھ کر سات لاکھ اور کل آبادی کا ۳۳ فیصد ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ فلسطینی مہاجرین میں ثلث سے زیادہ تعداد عیسائیوں کی ہے ’’تعبیر کی غلطی‘‘ اور حقائق سے چشم پوشی ہے۔

اس ’’مجاہد اعظم‘‘ نے فلسطین کو تسلیم کرنے کے لیے سائنس کا سہارا بھی لیا ہے۔ لکھتے ہیں: ’’وجود تو جرثومہ کا بھی تسلیم کیا جاتا ہے‘ حالانکہ وہ ننگی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ تو پھر اسرائیل کا وجود کیوں نہ تسلیم کیا جائے جنہوں نے بڑی حکمت عملی سے کروڑوں عربوں کے درمیان اپنے آپ کو زندہ رکھا ہوا ہے۔‘‘ یہاں گویا سرسید احمد خان کا طرزِ استدلال اپنایا ہے۔ صاحب موصوف نے اسرائیل کی ’’حکمت عملی‘‘ کی تعریف کی ہے۔ اقوام عالم جانتی ہیں کہ اسرائیل کی یہ حکمت عملی کیا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ’’اگرچہ جرثومہ نظر تو نہیں آتا لیکن پھر بھی اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے‘ تو اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے؟‘‘ تو اس کے جواب میں ہم صرف قرآن مجید کی سورۃ الممتحنہ کی ابتدائی آیت کا حوالہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ﴾

’’اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنے دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو‘ حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آ چکا ہے وہ اس کے منکر ہیں‘ اور وہ رسولؐ کو اور خود تمہیں اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے‘ شہر بدر کر چکے ہیں۔‘‘

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جس قوم نے سعی و کوشش ترک کر کے تن آسانی کو اپنا شیوہ اور تیغ و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنالیا وہ قوم یوں مٹ گئی جیسے خزاں رسیدہ پتّا درخت سے گرتا ہے اور ہوا کے دوش پر لڑھکتا پھرتا ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے چراغ روشن کیے اور اپنے اعمال کی خوبی کو دشمنوں سے منوایا اور جنہوں نے اپنی تاریخ خود بنائی' آج بھی ان کا ذکر عزت واحترام سے کیا جاتا ہے۔

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ راہ
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا!

اسرائیل ایک ایسے آتش فشاں کی مانند ہے جس سے برابر نفرت کا لاوا ابل رہا ہے' ایک ایسا سمندر ہے جس کی بغض آمیز لہریں کناروں سے اچھل رہی ہیں' ایک ایسا لاوا ہے جس سے شعلے لپک رہے ہیں' ایک ایسا افق ہے جس سے انگارے برس رہے ہیں اور ایک ایسا میدان ہے جہاں دور دور تک تشدد اور دہشت کے بگولے اٹھتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا ہمارے اندر اتنا شعور بھی نہیں جو کمزور بکریوں کو بھی اپنی بقا کے لیے سینگ مارنے پر مجبور کر دیتا ہے؟ کیا ہماری راہ میں کانٹے بچھانے والوں کو ہم تحفے میں پھول دیں؟ کیا ہم اپنے قاتل کو دودھ کا پیالہ پیش کریں؟ ''صوت الحق'' کے فقیہان کا یہی مسلک ہے۔ حکیم الاُمت علامہ اقبال نے ایسے ''فقہاء'' کے بارے میں کیا خوب کہا ہے: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان فقیروں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مؤمن کو غلامی کے طریق!

ایسے ہی ''نادان علماء'' کے بارے میں حضرت شیخ احمد سرہندی اپنے مکاتیب میں لکھتے ہیں:

''ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ' از شومیٔ علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند۔ ﴿اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾''

اسی طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ایک جگہ ان ''خود ساختہ فقیہانِ حرم'' کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''افسوس! ہر عہد اور ہر دور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں علماءِ سوء ہی کے ہاتھوں ہوئیں۔ وقت اور زمان کی شکایت بے سود ہے۔ سچ یہ ہے کہ عہدِ اکبری کے تمام فتنہ و فساد کے اصلی ذمہ دار یہی علماءِ سوء اور یہی عبید الدنیا تھے''۔

بہرحال یہ تو چند جملہ ہائے معترضہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل ہمارے لیے بلاوجہ شجرِ ممنوعہ قرار نہیں پایا۔ اس کی پشت پر ایک طویل تاریخ اور نہایت مستحکم نظریاتی تصورات اور اخلاقی و سیاسی روایات ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں برطانیہ نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کو ''مال و دولتِ دنیا'' کی پیشکش کی اور کہا کہ یہودیوں کو فلسطین میں جائیدادیں بنانے کی اجازت دے دیں۔ اس پر انہوں نے مُنہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہود میری لاش پر سے گزر کر ہی فلسطین میں آباد ہو سکتے ہیں۔'' ۱۹۱۴ء میں خلیفہ محمد خان خامس کو بھی جب اسی طرح کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا: ''میں فلسطین کی مٹی بھی نہیں دوں گا''۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضورﷺ نے فرمایا ہے کہ ''یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرو۔'' چنانچہ مسلمانوں نے خیبر کو فتح کر کے وہاں سے بھی یہودیوں کو نکال دیا۔ ۸۹۰ء میں شام سے نکال دیا تو یہ لوگ یورپ اور روس کے علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ ۹۱۰ء میں پرتگال سے نکالا' ۱۱۱۰ء میں سپین سے' ۱۲۹۰ء میں برطانیہ سے' ۱۳۸۰ء میں چیکوسلواکیہ سے' ۱۴۴۲ء میں ہالینڈ سے' ۱۵۴۰ء میں اٹلی سے اور ۱۵۵۱ء میں جرمنی نے بھی یہودیوں کو اپنے علاقوں سے نکال دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہودیوں کے ساتھ ہی یہ کیوں ہوا؟ یہ دراصل اُن کے کرتوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب اقوامِ متحدہ میں فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ منظوری کے لیے پیش کیا گیا تو اس مجوزہ تقسیم میں فلسطین کا ۵۲ فیصد یہودیوں کے لیے اور ۴۸ فیصد حصہ مسلمانوں کے لیے مختص کیا گیا۔ قائداعظم نے اس موقع پر فرمایا:

''مجھے اب بھی امید ہے کہ تقسیم فلسطین کا منصوبہ مسترد کر دیا جائے گا' ورنہ ایک خوفناک تصادم اور کشمکش ناگزیر اور لازمی امر ہے۔ پوری اسلامی دنیا اس فیصلے کے خلاف بغاوت کرے گی' کیونکہ اس کی حمایت نہ تاریخی اعتبار سے کی جا سکتی ہے اور نہ سیاسی اور اخلاقی طور پر۔ ایسے حالات میں پاکستان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ وہ عربوں کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کرے۔'' (اس لفظ ''غیر مشروط'' میں صوت الحق کے مضمون نگار کے لیے بڑی نشانی موجود ہے' جو کہتا ہے کہ اسرائیل کو تسلیم

کرنا چاہیے' کیونکہ بھارت عربوں کا دوست ہے)

علامہ اقبال نے مسئلہ فلسطین کی حکیمانہ تعبیر یوں پیش کی۔

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر پھر حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟

تاریخ گواہ ہے کہ پاکستانی مندوبین نے ہر جگہ فلسطینیوں کا مقدمہ بڑی شدّ ومدّ کے ساتھ لڑا ہے۔ اقوامِ متحدہ میں بڑی طاقتوں کے دباؤ کی وجہ سے اسرائیل کے حق میں پاس ہونے والی قرارداد کے بعد قائداعظم نے اس کو ایک ناجائز بچہ قرار دیا تھا اور صدر ٹرومین کو اس غیر معمولی ناانصافی پر ایک طویل خط بھی لکھا تھا۔

جب پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان امریکی دورے پر گئے تو امریکی جیوش کانگریس کے عہدے داروں نے ان سے ملاقات میں یہ پیشکش کی کہ اگر پاکستان فوری طور پر اسرائیل کو تسلیم کرلے تو ہم اسے معاشی ترقی و استحکام کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس پر لیاقت علی خان نے مُنہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

"Gentlemen! Our souls are not for sale."

''حضرات! ہماری روحیں بکنے کے لیے نہیں ہیں۔''

ایک اور جگہ پر خان لیاقت علی خان نے فرمایا: ''اگر پوری دنیا اسرائیل کو تسلیم کرلے ہم پھر بھی اس کو تسلیم نہیں کریں گے''۔

ان تاریخی حوالہ جات سے قطع نظر یکم ستمبر ۲۰۰۵ء کو پاکستانی اور اسرائیلی وزرائے خارجہ کے درمیان ہونے والی ''اتفاقیہ ملاقات'' کے مناظر سے پورے ملک میں روح کی ایک دلدوز چیخ سنی گئی جو ہمارے وجود اور ہماری شناخت پر چسپاں ہوگئی۔ پاکستان کے خوش بخت اور خوش قسمت شہری جناب خورشید محمود قصوری اسرائیلی وزیرخارجہ کے دیدار سے فیض یاب ہوئے اور اس پیمانِ وفا کی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہرے جو قائداعظم نے ''غیر مشروط'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے عرب فلسطینیوں سے کیا تھا۔

آخر میں فاضل مضمون نگار سے بس یہی کہنا چاہوں گا کہ کیا آپ ایک ایسے ملک کو تسلیم کرنے کے لیے دلیلیں تراشتے دربدر پھر رہے ہیں جو شام' عراق' مصر اور اردن پر قبضہ کرکے اتنی بڑی ریاست بنانا چاہتا ہے جو کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے دروازے پر درج اس عبارت سے ظاہر ہے: ''اے اسرائیل! تیری سرحدیں عراق سے مصر تک ہیں اور دوسری طرف شام

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms09-11a.inp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 5 (1,1)

سے مدینہ تک ہیں‘‘۔

کیا تم ایک ایسی ریاست کو تسلیم کرنا چاہتے ہو جو بیت المقدس کو اپنا دارالحکومت قرار دیتی ہے‘ اور مسجد اقصیٰ کو گرا کر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟

کیا تم ایک ایسے ملک کو تسلیم کرنے کی باتیں کرتے ہو جو مسلمانوں کا قتل عام کرتا ہے‘ خواتین کی بے حرمتی کرتا ہے اور بیت المقدس کی عزت کو پامال کرتا ہے؟

کیا تم ایک ایسے ملک کو تسلیم کرنا چاہتے ہو جس نے ۴۰۰ ایٹمی ہتھیار مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے بنائے ہیں؟

آخر میں ’’صوت الحق‘‘ کے صاحب اداریہ کے ’’خیال حسنہ‘‘ کے بارے میں ہم غالب کا یہ شعر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے!

☆☆☆

افکار و آراء

حالیه زلزلہ کے تناظر میں چند فکر انگیز تحریریں

کیا ہم اب بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کریں گے؟

عتیق الرحمٰن صدیقی، ہری پور

''التذکیر بایام اللہ'' اور ''انباء الرسل'' کے ضمن میں قرآن حکیم کی سورتوں میں سے سورۃ الاعراف کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس کی چند آیات ملاحظہ کیجیے:

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (الاعراف)

''مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے (نوحؑ کو) اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔''

﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾﴾ (الاعراف)

''آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے اسے (ہودؑ کو) اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے''۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾﴾ (الاعراف)

''آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔''

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 1 (1,1)

﴿وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۸۴﴾﴾ (الاعراف)

’’اور ہم نے اس قوم پر برسائی ایک بارش‘ پھر دیکھو ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔‘‘

﴿فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ (الاعراف)

’’مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے‘‘۔

ہم نے یہاں درج بالا سطور میں آیاتِ قرآنیہ کی صورت میں پانچ قوموں کے انجام کی نشان دہی پیش کی ہے۔ ان قوموں کا تعلق بالترتیب حضرت نوح‘ حضرت ہود‘ حضرت صالح‘ حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے ساتھ تھا۔ اِن سب اقوام نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی‘ ان کا مضحکہ اڑایا‘ طعنوں مہنوں سے انہیں اور ان کے پیروکاروں کو دق کیا اور قول وفعل دونوں سے اُن پر سنگ زنی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہ سب بگڑے ہوئے مسلمان تھے‘ اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر شرک کی نجاست میں بھی بری طرح مبتلا تھے۔ متنوع قسم کے اخلاقی رذائل نے ان کے فکر کو ژولیدہ بنا دیا تھا‘ وہ حق و راستی اور دیانت کی روش اپنانے میں طرح طرح کے خطرات محسوس کرتے تھے۔ ان کی تجارت‘ ان کی سیاست اور ان کی معاشرت سراسر بداخلاقی‘ بے ایمانی اور جھوٹ سے عبارت تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنے رسولوں کی نصیحت وموعظت کو اپنایا تو وہ دُنیوی طور پر تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے‘ وہ عیش وتنعم کی لذتوں سے محروم ہو جائیں گے‘ ان کی تفریحات معدوم ہو جائیں گی اور وہ تاریک دور میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ اپنی خرمستیوں اور سیہ کاریوں پر ہی نازاں رہے۔ نتیجہ کیا ہوا؟ آسمان پھٹ پڑا‘ زمین پانی ابلنے لگی‘ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بجز کشتی والوں کے غارت ہو کر رہ گئی‘ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھروں کی بارش برسی‘ حضرت صالح اور حضرت ہود علیہما السلام کی قوموں کو دہلا دینے والی آفتوں نے آ لیا اور وہ سب اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے‘ کمالِ فن نوازی ان کے کسی کام نہ آیا۔

یہ محض قصے کہانیاں نہیں کہ ہم انہیں پڑھ کر حظ اٹھاتے رہیں! قرآن نے انہیں وقت گزاری کے لیے بیان نہیں کیا۔ قوموں کا عروج وزوال معنویت سے خالی نہیں ہوتا‘ سرسبز و شاداب اور سونا اگلنے والی بستیاں جب کھنڈرات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو زندوں کے لیے اُن میں عبرت کا سامان ہوتا ہے۔ وہ زبانِ حال سے اپنا دکھڑا سنا رہی ہوتی ہیں‘ دیکھنے والی

ms

آنکھوں کے لیے‘ سننے والے کانوں کے لیے‘ فکرمند دلوں کے لیے اس میں بے شمار سبق پنہاں ہوتے ہیں۔غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ قوم صالح کی ویران بستیوں سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آج آثارِ قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ان کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو آپؐ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا‘ لہٰذا یہاں سے جلدی سے گزر جاؤ‘ یہ سیرگاہ نہیں‘ بلکہ رونے کا مقام ہے۔ان قوموں پر عذاب کیوں آیا‘ یہی سوچنے کی بات ہے اور بار بار سوچنے کی۔

۸؍اکتوبر کو پاکستان کی سرزمین کا ایک حصہ جھنجھوڑ دیا گیا‘ تاریخ کا بدترین زلزلہ رونما ہوا‘ کتنا ہی ہیبت ناک اور دہلا دینے والا تھا یہ! آن کی آن میں کتنی ہی بستیاں زمین بوس ہو گئیں! تھوڑی دیر کے اس ارتعاش نے قیامتِ صغریٰ کا سماں پیدا کر دیا‘ فلک بوس عمارتیں پیوند زمین ہو کر رہ گئیں‘ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح بکھر گئے‘ شہر اجڑ گئے‘ ویرانیوں نے ڈیرے ڈال دیے۔آہیں تھیں اور سسکیاں‘ ہر سو نالہ وشیون اور چیخ و پکار۔دانش کدوں میں پڑھنے والے نونہالانِ وطن نہ معلوم کس جستجو میں زیرِ زمین چلے گئے۔ہنستی بستی آبادیاں گہرے سکوت کی نذر ہو گئیں‘ ذرا سی دیر میں پورا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا۔زمین کے اندرونی خول میں مضبوط چٹانی پلیٹوں کا سرکنا بجا سہی‘ توانائی اور حرارت کے جمع ہونے اور خارج ہونے کے لیے جگہ کی تلاش درست سہی‘ زمین کی مختلف سطحوں کے باہمی ٹکراؤ سے بھی کسی کو انکار نہیں‘ زمین کے اوپر اور اندر کے درجہ حرارت میں بلا کے تفاوت کا بھی کوئی منکر نہیں‘ زمین کے اندر کا عدم توازن اور مسلسل شکست وریخت کے عمل سے بھی کوئی انکاری نہیں‘ دورِ جدید کے جدت آسا سائنسی اور فنی اکتشافات یقیناً خاصی اہمیت کے حامل ہیں‘ ماہرین ارضیات کی کاوشیں لائقِ تحسین ہیں‘ مگر کیا ان سب اسباب کے پس پردہ کوئی مسبب الاسباب نہیں؟ خالق کون ومکان کی تخلیق کیا بے مقصد اور بے جہت ہے اور کیا اس حکیم مطلق کی کوئی حکمت اس میں کارفرما نہیں؟ قوموں کے عروج وزوال میں کیا صرف طبیعی عوامل وغیرہ ہی کارفرما ہیں یا اس کے لیے خالق ارض وسماء نے کوئی اخلاقی اصول بھی وضع کر رکھے ہیں؟ کج فہم‘ کج رو لوگ یہ احمقانہ تصور ذہن میں بٹھا لیتے ہیں کہ حالات کا اتار چڑھاؤ اور بناؤ بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا‘ بلکہ قدرتی طور پر اچھے اور برے دنوں کی نمود ہوتی رہتی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 2 (1,1)

ہے۔ ایسے میں وہ مصائب و آفات سے کوئی اخلاقی سبق لینے سے قاصر رہتے ہیں۔
حضورﷺ نے فرمایا: ''مصیبت مؤمن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے' یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے' لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے اسے کیوں باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا''۔(الحدیث) قرآن کہتا ہے کہ:

﴿اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ؀۹۷ اَوَ اَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ؀۹۸ اَفَاَمِنُوۡا مَكۡرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ؀۹۹﴾ (الاعراف)

''پھر کیا بستیوں کے لوگ اِس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آ جائے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک اُن پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو''۔

اللہ کے رسول اپنی قوموں سے مخاطب ہو کر یہ کہتے رہے:

﴿وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ؀۵۲﴾ (ھود)

''اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے ربّ سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا' مجرموں کی طرح مُنہ نہ پھیرو''۔

صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جو قوم دنیا کی خوشحالی سے فریب کھا کر ظلم و معصیت کی راہوں پر چل نکلتی ہے اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن عین اُس وقت جبکہ وہ اپنے اس برے انجام کی طرف بگٹٹ چلی جا رہی ہو' اگر وہ اپنی غلطی محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل دی جاتی ہے' اس کی مہلت عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام' ترقی اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے''۔ (تفہیم القرآن)

ہمیں ارضی و سماوی آفات سے بچاؤ کے لیے یقیناً مختلف تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔زندہ قومیں اپنی بساط کی حد تک ہر لحظہ چوکنا رہتی ہیں' اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے فکرمند ہوتی ہیں' قابل عمل منصوبہ بندی کرتی ہیں اور ایسے ساز وسامان سے لیس ہوتی ہیں کہ متخالف اور تباہ کن حالات میں بہر طور پر اپنا تحفظ کر سکیں اور بلائے ناگہانی کا اپنے طور پر مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔مگر اس کے ساتھ ساتھ ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کا بھی جائزہ لیتے رہیں' ان گناہوں کا بھی جائزہ لیں جو لبرل ازم کے ناطے سے ہم ارادتاً کرتے ہیں' فحاشی' عریانی اور برہنگی کے اس سیلاب پر بھی دھیان رکھیں جس میں ہم بہتے چلے جا رہے ہیں' اللہ سے سرکشی' بغاوت' نافرمانی اور اس جور وظلم کی روش کو بھی پیشِ نظر رکھیں جو ہم نے بحیثیت قوم اپنا رکھی ہے۔اپنی ہی قدروں کے بخیے ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ادھیڑ رہے ہیں۔کیا ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے کہ رمضان کے عشرۂ رحمت میں اِس آفت سے ہم کیوں دوچار ہوئے؟ جدید سائنس کی توجیہات کے ساتھ ساتھ کیا ہم اس قسم کے واقعات پر اخلاقی پہلو سے سوچ بچار نہیں کریں گے کہ زمین جب انسانی گناہوں کا بار برداشت نہیں کر سکتی تو ہچکولے کھانے لگتی ہے اور اس میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔آج خیر کے جذبات ہی غالب ہیں' کیا ہم ان جذبات کو صحیح سمت پر لے جانے کی کوئی کوشش نہ کر پائیں گے اور اپنے ربّ سے معافی چاہتے ہوئے اس کی طرف پلٹیں گے نہیں؟ ہمارے حضور نبیٔ اکرم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیُ اَعُوُذُ بِکَ مِنُ زَوَالِ نِعُمَتِکَ وَتَحَوُّلِ عَافِیَتِکَ وَفُجَاءَ ةِ نِقُمَتِکَ وَجَمِیُعِ سَخَطِکَ)) (مسلم)

''خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے اور تجھ سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے اور تیرا غضب یکا یک ٹوٹ پڑے اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے''۔

☆☆☆

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 3 (1,1)

خدا سے بے خوف لوگوں کا مجمع

مسلم سجاد

یومِ آزادی کی شب تھی۔ اسلام آباد میں ایوانِ صدر کا سبزہ زار تھا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کے حکمران اپنی بیگمات‘ بیٹوں اور بیٹیوں‘ بہنوں اور ماؤں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آزادی کی شب منائی جارہی تھی۔ نغمے اور گانے گائے جارہے تھے۔ رقص بھی ہوئے اور صدرِ مملکت نے بذاتِ خود بھی رقص فرمایا۔ اسی دوران وقفے وقفے سے کیٹ واکس (catwalks) ہوئیں۔ یہ نت نئے فیشن کا مظاہرہ کرتی مادرِ وطن کی بیٹیاں خراماں خراماں آتیں اور سامنے سے اور پشت سے جسم کے نشیب وفراز دکھاتی چلی جاتیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں سے داد وصول کرتیں‘ ماں اور بیٹے ایک ساتھ تالیاں بجاتے۔

یہ پروگرام کراچی یا لاہور کے کسی پوش بنگلے کے سبزہ زار پر منعقد ہوتا اور شرکاء خرمستیاں کرتے تو کہا جاسکتا تھا کہ چاردیواری کے اندروہ جانیں‘ ان کا اللہ جانے۔ لیکن آزادی کی رات ایوانِ صدر میں یہ پروگرام ہوا اور پورے ملک میں فخر سے بلکہ سینہ ٹھونک کر دکھایا جائے تو ایک پاکستانی کی حیثیت سے دل صدمے کا شکار ہوتا ہے۔

پروگرام ختم ہوا تو صدرمملکت اسٹیج پر تشریف لائے‘ فرمایا: یہ جو پروگرام ہوا ہے‘ بہت اچھا ہوا ہے۔ یہ ہماری ’’خوشگوار تصویر‘‘ (soft image) ہے۔ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم یہ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: جن لوگوں کے مذہب میں یہ کوئی رکاوٹ بنتا ہے‘ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی عقلوں اور آنکھوں سے پردہ اٹھادے۔

میں کانپ گیا۔ ایک ہوتا ہے خدا کے غضب کو دعوت دینا۔ اس حوالے سے بھی ہم بہت کچھ کررہے ہیں۔ لیکن ایک ہوتا ہے خدا کے غضب کو بھڑکانا۔ صدرِ مملکت کی دعا اسی ذیل میں محسوس ہوئی۔

تصور کیجیے کہ موقع کیا ہے؟ یہ ملک کس لیے حاصل کیا گیا؟ (۵۸ سال اس کے ساتھ ہم نے جو بھی کیا ہو) ملک بننے کے موقع پر جو قربانیاں دی گئیں‘ ہنستے بستے شہر جس طرح اجڑ گئے‘ معصوموں اور حیاداروں کی عزتیں جس طرح لوٹی گئیں‘ جو خون بہا وہ سب اس ملک کی

بنیادوں میں شامل ہے۔ الیکٹرانک میڈیا تو کل کی پیداوار ہیں، تاریخ سے بے بہرہ ہیں، لیکن پرنٹ میڈیا میں تو جدوجہدِ آزادی کے ساتھ قربانیوں کے تذکرے ضرور ہوتے ہیں (جب تک انہیں منافرت پیدا کرنے کے الزام کے تحت بند نہ کروا دیا جائے)۔ ایوانِ صدر کے اس پروگرام نے آزادی کے لیے قربانی دینے والوں کی روحوں کو کس کس طرح نہ تڑپایا ہوگا۔ اور ابھی تو زمین پر وہ نسل موجود ہے جس نے آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔

غضب کو بھڑکانے کی بات اس لیے محسوس ہوئی ہے کہ تاریخ سے، ماضی سے، بلکہ مستقبل سے بھی آنکھیں بند کر کے مادر پدر آزاد پروگرام کرنے پر اظہارِ فخر بھی ہے۔ اس کو اسلام کے مطابق نہ سمجھنے والوں پر نکیر ہے، بلکہ جرأت دیکھیں کہ اللہ سے یہ دعا بھی ہے کہ وہ منکرات کو غلط سمجھنے والوں کی نظروں اور دماغ کو ان حکمرانوں کی طرح کر دے تاکہ وہ ''روشن خیالی'' اور ''اعتدال پسندی'' کی عینک لگا کر ناچ گانوں اور کیٹ واک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ''حقیقی خوشگوار تصویر'' اور دینی لحاظ سے جائز سمجھیں۔

۲۵ سال میں ہم نے آدھے سے زیادہ ملک گنوا دیا اور اب جتنا بچا ہے اور جتنا خودمختار رہ گیا ہے، سب کو نظر آتا ہے۔ ہماری آزادی چھن چکی ہے، بہت سوں کو خبر نہیں ہے۔ ہم بغیر لڑے ہی ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے لیے ہمیں براہِ راست احکام ملتے ہیں اور ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور ہمیں چپ رہنا پڑتا ہے۔ اپنے ٹی وی پر ہم خود اپنے عالمی اعلیٰ مقام کے گن گاتے ہیں۔ (بھلا اپنی قوم کو فروخت کر کے بھی کسی کو عزت ملی ہے!) اور حال یہ ہے کہ ہفت روزہ ''ٹائم'' نے ماڈرن ایشیا پر اسپیشل ڈبل ایشو نکالا ہے تو پاکستان جیسے ''عظیم ملک'' کا ذکر ہی نہیں، جب کہ نیپال اور ویت نام کا ہے۔ (غالباً اُن کی منطق کے مطابق جب انڈیا کا ذکر کر دیا تو پاکستان پر الگ اسٹوری کی کیا ضرورت ہے)۔

بات ہو رہی تھی صدرِ مملکت کی دعا کی اور خدا کے غضب کو بھڑکانے کی۔ یہ پروگرام جس موقع پر ہوا ہے، جہاں ہوا ہے اور جس طرح پوری قوم کو گواہ کر کے ہوا ہے، اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ معلوم نہیں اللہ کی دی ہوئی ڈھیل کب ختم ہو جائے۔ ہم اپنی باتوں میں، کھیل کود میں اور کیبل سے طرح طرح کے چینل دیکھنے میں مشغول ہوں اور اللہ کی پکڑ آ جائے۔ اگر پاکستانی ایک بیدار قوم ہوتے تو اِن حکمرانوں کو ٹی وی پر یہ پروگرام دکھانے کی جرأت نہ ہوتی (یحییٰ خان کو اتنی شرم تھی کہ اپنی کارروائیاں کچھ نہ کچھ اخفا کے ساتھ کرتا تھا)۔ اب سب

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 4 (1,1)

کچھ ببانگِ دہل ہے۔ اس لیے جو دیکھتا ہے' کچھ نہیں کرتا' کچھ نہیں کہتا' وہ بھی اس میں شریک ہے۔ نسیم حجازی کے ناولوں میں پڑھا ہوا ایک جملہ یاد آتا ہے کہ قدرت افراد کے گناہوں سے صرفِ نظر کر لیتی ہے لیکن قوموں کے اجتماعی جرائم معاف نہیں کیے جاتے۔

اگر قوم بیدار ہو' اس کے نوجوان' بچے' مرد و عورت بیدار ہوں تو اس طرح کے حکمران مسلط ہی نہ کیے جائیں۔ آج بھی یقیناً سب نہیں سو رہے' کچھ لوگ ضرور جاگ رہے ہیں۔ اگر یہ جاگنے والے خود جاگتے رہیں' سونے والوں کو نہ اٹھائیں' تو اُن کا حشر ان سونے والوں کے ساتھ ہو گا۔ کشتی میں چھید کرنے والوں کا ہاتھ نہ پکڑا گیا تو کشتی سب سواروں کو لے ڈوبے گی۔

﴿اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَؕ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوۡا مَكۡرَ اللّٰهِ‌ۚ فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ﴿۹۹﴾﴾ (الاعراف)

''پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آ جائے گی' جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک اُن پر دن کے وقت نہ پڑے گا' جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو''۔

﴿فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ﴿۴۴﴾﴾ (الانعام)

''پھر جب انہوں نے اُس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی' بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے' یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں' خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا''۔

(شذرات۔ ترجمان القرآن' ستمبر ۲۰۰۵ء)

☆☆☆

نئی زندگی کا تقاضا......اجتماعی توبہ

پروفیسر عبدالماجد' مانسہرہ

حالیہ زلزلہ ربّ العالمین کی طرف سے اہل پاکستان' خصوصاً ہزارہ اور آزاد جموں و کشمیر کے لیے ایک آزمائش اور تنبیہہ سے کم نہیں۔ ہزاروں لوگ اس میں جاں بحق ہوئے اور بے شمار زخمی ہوئے' لیکن اُن لوگوں نے بظاہر کوئی سبق حاصل نہیں کیا جن کو اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت سے محفوظ رکھا' حالانکہ ہم سب کے لیے جو اِس میں زندہ وسلامت رہے' بڑا سبق ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی سابقہ باغیانہ روش سے باز آ جائیں' خدا اور رسول ﷺ کے احکامات وفرامین کی پابندی کریں' سود' جھوٹ' دھوکہ دہی' عہد شکنی' خیانت' چوری' ملاوٹ اور ناقص تعمیر وغیرہ کی برائیوں سے کنارہ کشی اختیار کریں اور سچے دل سے اپنے ربّ کے حضور توبہ کریں۔

توبہ کا مطلب ہے کہ ہم اپنی غلط اور باغیانہ طرزِ زندگی سے واپس پلٹیں اور اپنے ربّ سے سچا تعلق استوار کریں' اس کے دین سے چمٹ جائیں اور آئندہ ہر قسم کی برائی سے بچنے کا ارادہ کریں۔ صرف زبان سے وقتی طور پر توبہ توبہ کہنا حقیقی توبہ نہیں جب تک ہم عملی طور پر توبہ کا اظہار نہیں کریں گے۔

دوسرے یہ کہ جو ہزاروں مسلمان اس دارِ فانی کو چھوڑ گئے ان کے لیے دعائے مغفرت کریں اور سوچیں کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بچایا ہے تو اس میں کوئی خاص حکمت ہے' اور وہ یہ کہ ایک اور موقع فراہم کیا' بلکہ نئی زندگی عطا کی تاکہ ہم اپنے یقین وایمان اور اعمال کی درستی کر کے نجات پالیں اور قوم یونسؑ کی طرح اجتماعی توبہ کریں تو پھر یہ آیا ہوا عذاب (بشکل مزید جھٹکے اور زلزلہ) ٹل سکتا ہے' کیونکہ قوم یونسؑ پر بھی عذاب سامنے آ گیا تھا لیکن ان کے مردوں' عورتوں' بڑوں اور چھوٹوں نے مل کر اجتماعی توبہ کی تو اللہ ربّ العزت نے آیا ہوا عذاب بھی ان سے ہٹا دیا۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۹۵﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴿۹۷﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا
قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 5 (1,1)

وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ﴿۹۸﴾ (یونس)

’’اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں میں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو‘ ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں میں سے۔ بے شک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر تمہارے ربّ کی بات‘ وہ ایمان نہیں لائیں گے خواہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں‘ جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب۔ پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونسؑ کے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دُنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک۔‘‘

آج دوبارہ ہمیں اجتماعی توبہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہر آدمی اپنے اندر جھانکتے ہوئے اور اپنی برائیوں اور کوتاہیوں پر نظر کرتے ہوئے ربّ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگے اور دوسروں کی عیب جوئی کا وطیرہ چھوڑ دے۔ ہاں دعوت و تبلیغ اور نصیحت کا فریضہ ضرور انجام دے (کیونکہ روزانہ اس دنیا سے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ افراد چلے جاتے ہیں اور ہم میں سے ایک کو بھی معلوم نہیں کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں میرا نام ان مرنے والے ڈیڑھ لاکھ افراد کی لسٹ میں ہے یا نہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی تنبیہہ آج بھی بدستور قائم ہے:

﴿اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ﴿۱﴾﴾ (الانبیاء)

’’لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا اور وہ غفلت میں مُنہ پھیرے ہوئے ہیں‘‘۔

اور:

﴿وَكَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً وَّاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ﴿۱۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ﴿۱۲﴾ لَا تَرۡكُضُوۡا وَارۡجِعُوۡۤا اِلٰی مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ وَمَسٰكِنِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡئَلُوۡنَ﴿۱۳﴾ قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتۡ تِّلۡكَ دَعۡوٰٮهُمۡ حَتّٰی جَعَلۡنٰهُمۡ حَصِيۡدًا خٰمِدِيۡنَ﴿۱۵﴾﴾ (الانبیاء)

’’اور کتنی ہی بستیاں ہم نے تباہ کر ڈالیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد دوسری قوموں کو پیدا کیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب آتا ہوا دیکھا تو وہاں سے بھاگنے لگے‘ (ہم نے کہا آج) مت بھاگو اور لوٹ جاؤ جہاں جہاں تم نے عیش و آرام کیا تھا اور اپنے گھروں میں‘ شاید کہ اب تمہارا کوئی پرسانِ حال ہو۔ وہ کہنے لگے ہماری کم بختی کہ ہم ہی ظالم تھے۔ پھر برابر رہی ان کی یہ فریاد اور شور یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی اور بجھی ہوئی آگ کی طرح نیست و نابود کر دیا۔‘‘

آزمائش یا انتباہ؟

شمائلہ مظفر

علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

بلاشبہ یہ بات اقبال نے بہت پہلے کہی تھی، لیکن اُس وقت بھی اُمت مسلمہ کا یہی حال تھا کہ ہر جگہ ہی مسلمان پریشان، مظلوم اور تباہ حال تھے۔ اور آج بھی جب ہم اطراف عالم میں نظر دوڑاتے ہیں تو چاہے کشمیر ہو یا فلسطین، چیچنیا ہو یا بوسنیا، افغانستان ہو یا عراق، یا پھر ہمارا پیارا پاکستان، ہر جگہ ہی مسلمان ذلت و پستی، مشکلات و مصائب اور تنگ و افلاس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جب ہم مسلمانوں کے زوال کی بات کرتے ہیں تو اپنا غبار امریکہ، اسرائیل اور ہندوستان وغیرہ کے خلاف نکالتے ہیں۔ لیکن اب جو یہ ذرا مختلف نوعیت کی اتنی بڑی مصیبت زلزلے کی صورت میں پاکستان پر نازل ہوئی ہے تو کیا اہل بصیرت اب بھی ہوش میں نہیں آئیں گے؟

کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے کہ دنیاوی قوتیں تو مسلمانوں کے خلاف ہیں ہی، لیکن ہمارے پروردگار نے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، جس کے آگے سر جھکاتے ہیں اور جس کی بندگی کا صبح و شام اقرار کرتے ہیں، اتنی بڑی مصیبت ہم پر کیوں ڈالی!

امریکہ پر تو جب کترینا اور ریٹا نامی طوفان آئے تو ہم نے یہ کہا کہ یہ ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے، اللہ نے ان کا گھمنڈ ختم کرنے کے لئے یہ اقدامات کیے ہیں۔ لیکن ان دونوں طوفانوں سے امریکہ میں اتنی بڑی تباہی و بربادی نہیں ہوئی جتنی اس ایک زلزلے سے ہمارے یہاں ہوئی۔

کیا ان مصیبتوں کے پس منظر میں ہمیں سورۃ البقرۃ کی یہ آیت گونجتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط﴾

''اور ذلت اور محتاجی ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔''

اور آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ﴾

’’یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔‘‘

یعنی یہ ذلت و خواری‘ یہ محتاجی و مسکنت ہمارے اعمالِ بد کی وجہ سے ہم پر مسلط کر دی گئی ہے۔ ہم لاکھ اس کو اپنی آزمائش کا نام دے کر دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں‘ لیکن یہ آزمائش نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جو لوگ مر گئے ان کی کیسی آزمائش‘ ان کی تو مہلتِ عمل ہی ختم ہو گئی‘ اور دوسری بات یہ کہ آزمائش کی بات جب آتی ہے جب بندے کے تمام گناہ اس کی توبہ اور اس کے نیک اعمال کی وجہ سے معاف ہو چکے ہوتے ہیں‘ تو اللہ تعالیٰ اس کا رتبہ بڑھانے کے لیے اس کو آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن بنا دیتے ہیں۔ اب ہم ذرا اپنے آپ پر نظر ڈالیں اور یہ فیصلہ کریں کہ کیا ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہم پر عذاب نہیں بلکہ آزمائش آئے؟ یہ آزمائش ہرگز نہیں ہے‘ بلکہ یہ عذاب کے کوڑے ہیں جو ہم پر برس رہے ہیں۔ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے کہ ہم کو کہیں عافیت نصیب نہیں ہو رہی۔ کہیں امریکہ نامی کوڑا مسلمانوں کی پیٹھ پر برس رہا ہے تو کہیں یہود و ہنود نے اللہ کے عذاب کا روپ دھار رکھا ہے۔

بحیثیت مسلمان ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہمارے اعمال نے ہمیں مستحق عذاب ثابت کر دیا ہے تو اب یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ چاہے تو ہمیں طاغوتی طاقتوں کے ذریعے عذاب دے‘ یا مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو قتل کروائے یا آسمان سے آفات نازل کرے۔ لیکن جب عذاب قدرتی آفات کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سمجھنے والوں کے لیے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کسی ملک کی دہشت گردی نہیں ہے نہ یہ کسی کی ذاتی دشمنی ہے‘ بلکہ عذابِ الٰہی ہے۔ اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو پاکستان تو ہر طرح سے اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ پاکستان کا قیام ہی اسلام کے نام پر ہوا تھا‘ اس کو اسلام کا قلعہ بنانے کا عزم کیا گیا تھا‘ اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ یہاں اللہ کے احکامات کو نافذ کیا جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم گناہوں کی دلدل میں دھنستے چلے گئے‘ نافرمانی اور گستاخی کی حدود پھلانگ کر بانگ دہل انتہائی ڈھٹائی سے اسلام کو فرسودہ بتانے لگے‘ اسلامی نظام کو ناقابلِ عمل اور اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی کہنے لگے‘ نئے اور روشن خیال اسلام کی باتیں کرنے لگے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ

کہ سودی نظام کو جب ہم نے اپنی معیشت کا جزو لاینفک قرار دے دیا' تو پھر یہ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے ہی۔ اب مقابلہ کریں ان آفات کا۔

جب ہم نے فحاشی' عریانی' چور بازاری' رشوت' سود' شراب نوشی' دغابازی اور قتلِ ناحق وغیرہ سے آگے بڑھ کر اسلام کی تعلیمات میں بھی ترمیم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ اتنا بڑا زلزلہ بھیجا کہ پوری قوم ہل کر رہ گئی۔ یہ زلزلہ ملک کے ایک حصے کے لیے تو عذاب کی صورت ہے اور دوسرے کے لیے ایک تنبیہہ اور وارننگ ہے کہ خدا کے لیے اب بھی سنبھل جاؤ' فوراً ربّ کائنات کے حضور سجدے میں گر کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرو' اور سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے اس بات کا وعدہ کرو کہ آئندہ چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔

لیکن ہمارے یہاں یہ تو نظر آ رہا ہے کہ لوگ زلزلے کا شکار ہونے والے لوگوں کے لئے بہت پریشان ہیں اور ان کی مدد کرنے کے لئے دامے' درمے' سخنے ہر طرح سے تیار ہیں' لیکن افسوس! یہ نظر نہیں آ رہا کہ ان کو اپنی بھی کوئی فکر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے بالکل بے فکر ہیں کہ ان کو تو ایسا کوئی عذاب اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ کچھ پتا نہیں ہے کہ اگلے ہفتے' اگلے مہینے' اگلے سال یا چند سالوں بعد ایسا ہی کوئی عذاب آ کر ہم سب کو بھی نیست و نابود کر دے' اور ہمارے پیچھے کوئی مغفرت کی دعا کرنے والا اور کفنانے' دفنانے والا بھی نہ ہو' اور ہماری متعفن لاشوں کو بھی اجتماعی قبروں میں ڈال کر زمین کو صاف کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے انجام سے محفوظ رکھے!

مختصراً یہ کہ اس واقعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ ہم سے راضی نہیں ہے' وہ ہماری طلبِ رحمت کی دعائیں قبول نہیں کر رہا۔ قرآن کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں پر اتنا ناراض نہیں ہوتا جتنا ایمان لانے کے بعد اُن مسلمانوں پر ہوتا ہے جو انتہائی ڈھٹائی سے سینہ تان کر اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اللہ کو راضی کرنا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں ترک کر کے ایک اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ اس لیے کہ یہود و نصاریٰ کی دوستی سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا' کیونکہ قرآن پاک میں آتا ہے کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ﴾ (المائدۃ: ۵۱)

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms15-11 kia hum allah ki taraf.inp 8/22/2014 3:32 PM PAGE 7 (1,1)

”اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ‘ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

لہٰذا ہمیں صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے‘ اسی میں ہماری دنیاوی اور اُخروی فلاح ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ کی دوستی کا معاملہ تو غالب کے اس مصرع کے مصداق ہے کہ۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

ورنہ ع

”پیوستہ رہ کفر سے اُمیدِ عذاب رکھ!“

بقیہ: افکار و آراء

(باقی صفحہ 90 پر)

اشراقی تجدّد کا جائزہ

تحریر: مولانا گوہر رحمٰنؒ

اگست اور ستمبر ۲۰۰۵ء کے میثاق میں مولانا گوہر رحمٰن صاحبؒ کا ایک گرانقدر علمی و تحقیقی مقالہ بعنوان ''التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم'' شائع کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ اوّلاً ماہنامہ فاران کراچی بابت جون ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ فاران میں اس مقالے کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد ماہنامہ اشراق لاہور بابت اپریل ۱۹۹۶ء میں خورشید احمد ندیم صاحب کے ایک مضمون میں مولانا محترم کے مقالے کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ اس کے جواب میں مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے ۵/جون ۱۹۹۶ء کو زیرِنظر مقالہ تحریر فرمایا جس میں ناقد کے استدلال کی کمزوری کو واضح کیا گیا اور ان کی تنقید کا مسکت جواب دیا گیا۔ یہ مقالہ بھی مولانا مرحوم کی کتاب ''تفہیم المسائل'' کی جلد پنجم میں موجود ہے۔

التزامِ جماعت کے مضمون پر ماہنامہ اشراق کی تنقید کا جائزہ

ماہنامہ ''فاران'' کراچی بابت جون ۱۹۹۵ء میں التزامِ جماعت کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون کسی کے خلاف نہیں تھا بلکہ مثبت تھا' تاہم اس میں ماہنامہ ''اشراق'' لاہور اور ''جماعت المسلمین'' کراچی کے نقطہ ہائے نظر کا ذکر بھی کر دیا گیا تھا۔ اشراق کی رائے یہ ہے کہ نفاذِ شریعت سے منحرف اور کفرِ بواح کی مرتکب حکومت بھی الجماعۃ ہے جب تک کہ عامۃ الناس کا اعتماد اسے حاصل ہو' اور پاکستان کی حکومت اس سرزمین کے مسلمانوں کے لیے الجماعۃ ہے اور اس کی وفاداری اور التزام واجب ہے۔ اور جماعت المسلمین کی سوچ یہ ہے کہ محترم جناب مسعود احمد صاحب کی امارت میں آج سے غالباً ۳۲ سال قبل جماعت المسلمین کے نام سے جو غیر حکومتی نظم قائم ہوا تھا' وہی الجماعۃ ہے۔ افراط وتفریط پر مبنی ان متضاد آراء کو پڑھ کر ایک عام مسلمان الجھن کا شکار ہو سکتا تھا اور اسلام

کے اجتماعی نظام کے بارے میں اشتباہات و اشکالات میں مبتلا ہو سکتا تھا' اس لیے میں نے وقت کی ضرورت سمجھ کر اپنے علم و فہم کے مطابق ''الجماعۃ'' کے مفہوم کی تنقیح و تفہیم کے لیے یہ مضمون لکھا تھا' کسی کے ساتھ مناظرہ مقصد نہیں تھا' لیکن جماعت المسلمین کے جناب رضوان اللہ خیراتی صاحب نے اسے مناظرہ سمجھ کر چار ماہ بعد ایک جوابی اور تنقیدی تحریر لکھی جو ''فاران'' بابت نومبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ خیراتی صاحب کے مضمون کے تجزیے اور اپنی رائے کی مزید وضاحت پر مشتمل میری تحریر فاران کے اسی شمارے میں شائع ہو چکی ہے جس میں ان کا جوابی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں خیراتی صاحب کا ایک اور مضمون بھی شائع ہوا ہے' لیکن اس میں کوئی نئی بات نہیں لکھی گئی بلکہ انہی باتوں کو دہرا دیا گیا ہے جن کا جواب دیا جا چکا تھا' اس لیے اس کا جواب دینا تحصیل حاصل ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر کے ترجمان محترم جناب خورشید احمد ندیم صاحب نے میرے مضمون کی اشاعت کے پورے ۹ ماہ بعد اشراق' بابت اپریل ۱۹۹۶ء میں میری رائے کی تردید اور اپنی رائے کی تائید میں ایک مضمون شائع کیا ہے' جس میں میرے دلائل کا جواب دینے اور اپنی رائے کی تائید میں کوئی نئی دلیل لانے کی جگہ انہی پرانی باتوں کو دہرایا گیا ہے جن کا دلائل کے ساتھ میں نے جواب دے دیا تھا۔

علمی مذاکرہ حق معلوم کرنے' اشکالات رفع کرنے اور فکر کی صحیح تعمیر میں مفید ثابت ہو سکتا ہے' بشرطیکہ افہام و تفہیم' استدلال و تحقیق اور باہمی افادے اور استفادے کے ذریعے حق کی تلاش اصل مقصد ہو' خلط مبحث اور کھینچا تانی کے ذریعے بات کو الجھانا اور اصل بات کو چھپانا مقصود نہ ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اشراق کے اس فاضل ترجمان نے خلط مبحث سے کام لے کر خروج اور مسلح جدوجہد کو بحث کا مرکزی نکتہ بنا دیا ہے' حالانکہ یہ نہ ہماری رائے ہے اور نہ اس وقت زیر بحث ہے۔ اسی طرح حکومت بالفعل اور حکومت بالحق کے درمیان جو فرق میں نے اپنے مضمون کے آغاز ہی میں بیان کر دیا تھا اس کا جواب دیے بغیر اور اسے بالکل نظر انداز کر کے پھر وہی باتیں دہرا دی گئی ہیں جن کا تعلق حکومت بالفعل سے ہے' اور مولانا مودودیؒ کے ۱۹۴۱ء کے اقوال غیر ضروری طور پر نقل کر دیے گئے ہیں جن کا تعلق حکومت بالفعل سے ہے' الجماعۃ کے مفہوم کے ساتھ ان کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

ندیم صاحب کے جوابی مضمون پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی فکر

اور اشراق والوں کی فکر کے درمیان جو فرق ہے اسے بیان کر دوں' تا کہ قارئین دونوں تحریروں کے لکھنے والوں کی سوچ کو مدنظر رکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں' اس لیے کہ ہر شخص کی تحریر اور تقریر اس کی فکر کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس فرق کا خلاصہ یہ ہے کہ میں قرآن وسنّت کے فہم وتفہیم اور تعبیر وتشریح میں سلف صالحین کے اصول کا پابند ہوں اور ان کی تحقیقات کا خوشہ چین ہوں' مگر ہمارے دور کے اشراقی دانشور تجدد کے اصول کے مطابق سلف صالحین کے اصول اور تحقیقات سے آزاد ہو کر قرآن وسنّت اور دین کی تعبیر وتشریح اور فہم وتفہیم کا کام کر رہے ہیں۔ اجماعی مسائل کو اپنے اجتہاد کا تختۂ مشق بنانا' قرآن وسنّت کی قطعی اور واضح نصوص سے ثابت شدہ مسائل کو مظنون ومشکوک ٹھہرانا اور بخاری ومسلم کی متفق علیہ احادیث کو رد کر دینا یا ان کی تکلفی تاویل کرنا ان تجدد پسند سکالروں کے لیے بڑا آسان ہے' مگر مجھ جیسے سلفی فکر رکھنے والے شخص کے لیے بڑا مشکل ہے۔

میری سوچ کے بنیادی زاویے درج ذیل ہیں:

۱) دین اسلام قرآن وسنّت کے احکام کا نام ہے اور قرآن وسنّت کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔

۲) قرآن کریم کی تعبیر وتفسیر کے لیے سیاقِ کلام' نظائر' حدیث رسولؐ ' اقوال صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کی تحقیقات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے' اس لیے کہ قرآن کے الفاظ کی طرح اس کے معانی بھی تواتر وتسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں' صرف عربی لغت اور شخصی فہم کی بنا پر آزادانہ تعبیر وتفسیر صحیح طرزِ فکر نہیں ہے۔

۳) قرآن وسنّت کی اجماعی اور قرونِ اولیٰ میں طے شدہ تعبیر کے خلاف تعبیر کرنا تجدد ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے' البتہ صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کے درمیان اختلافی تعبیرات میں سے کسی ایک کو دوسری پر دلائل کے ساتھ ترجیح دی جا سکتی ہے۔

۴) اجتہاد کا راستہ قیامت تک کھلا ہے' لیکن ماہرین کی اجماعی تحقیق کے خلاف محض عقلیت کی بنیاد پر اجتہاد کرنا تجدد ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۵) جدید دور کے مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل پیش کرنا ضروری ہے' لیکن اس کے لیے تجربہ کار فقہاء ومحدثین اور مسلمانوں کے معتمد علمی مراکز سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مستند اور راسخ العلم علماء کی تحقیق کے خلاف طبع آزمائی کرنا اور تفرد کا شوق پورا کرنا فکری بگاڑ کی علامت ہے۔

٦) عرف' رواج اور حالات کے بدلنے سے فتویٰ بدلا جا سکتا ہے' جیسا کہ ابن قیم نے اعلام میں اس کے لیے مستقل باب قائم کیا ہے۔ اسی طرح اختلافی اور اجتہادی مسائل میں ضرورت کی بنا پر ایک رائے چھوڑ کر دوسری رائے اختیار کی جا سکتی ہے' لیکن قرآن و سنّت کی اجماعی تعبیر کو عرف و حالات کی وجہ سے نہیں بدلا جا سکتا۔

یہ ہے میری وہ سوچ جو علماء راسخین کے تلمذ اور صحبت' اسلاف کی کتابوں کے مطالعے اور تفسیر و حدیث کی تدریس و تحقیق کے ۳۰ سالہ طالب علمانہ تجربے سے بنی ہے' اس لیے میرے لیے اپنے دور کے اشراقی مجتہدین کے اجتہادات و تفردات اور ان کی تنہا پرواز کا ساتھ دینا بڑا مشکل ہے۔

تنقیح طلب مسائل

دراصل یہاں تین الگ الگ مسائل ہیں جن کو ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط کر کے بات کو الجھا دیا گیا ہے' ایک ہے الجماعۃ کا شرعی مفہوم' دوسرا ہے خروج کا شرعی حکم اور تیسرا ہے دینی تنظیموں کا شرعی حکم ۔ان مسائل کی نوعیّتوں میں فرق ہے' اس لیے ان پر الگ الگ عنوانات کے تحت غور کرنا ضروری ہے۔

''الجماعۃ'' کا شرعی مفہوم

یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ الفاظ کے معنی سیاق و سباق' فحوائے کلام اور موقع و محل کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں اور کسی لفظ کا ہر جگہ ایک ہی معنی متعین کر دینا صحیح نہیں ہوتا۔ الجماعۃ کے شرعی مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کے سیاق و سباق اور مواقع استعمال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے' ایک سیاق میں اس کے ایک معنی ہوتے ہیں اور دوسرے سیاق میں دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ احادیث رسولؐ اور اقوالِ صحابہ و تابعین میں الجماعۃ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ جماعت کے معنی تو واضح ہیں اور اُمت مسلمہ کے معنی بھی واضح ہیں کہ اس سے مراد وہ عالمی اسلامی جماعت ہے جو محمدﷺ کی قیادت و رسالت میں تشکیل پائی تھی' اور یہ پوری دنیا میں ایک ہی جماعت ہے' جس میں شامل ہونا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا ہے اور اس سے نکلنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونا ہے۔ لیکن الجماعۃ کے شرعی معنی کیا ہیں؟ مختلف احادیث میں اس لفظ کے مواقع استعمال کو مدنظر رکھتے ہوئے شارحین حدیث نے اس لفظ کا جو شرعی مفہوم متعین کیا ہے اس کی وضاحت اور تفصیل کے لیے میں نے مضمون لکھا تھا جس کا چند الفاظ میں خلاصہ

یہ ہے کہ:

''اسلامی حکومت پر مجتمع و متحد ہونے والے مسلمانوں کو بھی الجماعۃ کہا جاتا ہے اور التزام الجماعۃ کی ہیئت کاملہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ لیکن احادیث میں الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو سنّتِ رسولؐ اور سنّتِ اصحابِ رسولؐ کا التزام کرتے ہوں، جن کو اہل سنّت والجماعۃ کہا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس حکومت اور اقتدار موجود نہ ہو۔ اور التزام جماعت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل سنّت و الجماعۃ کے اصولوں کی پابندی کی جائے اور ان سے خروج و شذوذ نہ کیا جائے''۔

اپنی اس تحقیق کے شرعی دلائل، اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اور ممکنہ سوالات کے جوابات میرے محولہ بالا مفصل مضمون میں موجود ہیں، دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن فکر اشراق کے نمائندے نے میرے دلائل کا جواب دیے بغیر اپنی رائے کو درست اور میری رائے کو نادرست قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہمارے نزدیک ان کا یہ کہنا کہ وہی حکومت الجماعۃ ہو سکتی ہے جو اقامت دین کرتی ہو، درست نہیں ہے۔ دین کو قائم کرنا الجماعۃ کے فرائض میں سے ہے لیکن اس کے قیام کی علت نہیں ہے۔ مسلمانوں کا ہر وہ اجتماعی نظام جو ان کے عمومی اعتماد پر قائم ہو اور انہیں باہم مجتمع رکھتے ہوئے انتشار سے بچائے، الجماعۃ ہے۔ اگر اہل اقتدار واقعتاً کفر بواح کا ارتکاب کریں تو بھی ان کی حکومت الجماعۃ ہے، تاہم اس سے یہ فرق واقع ہو جاتا ہے کہ اس مرحلے پر ضروری شرائط کے ساتھ ان کے خلاف خروج جائز ہو جاتا ہے۔ الجماعۃ کے باب میں دینی نصوص کا ہمیشہ یہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور اُمت کے جلیل القدر فقہاء اور علماء سے یہی نقل ہوتا آیا ہے''۔ (۱)

معلوم نہیں کہ مخالف نقطۂ نظر کے دلائل کو نظر انداز کر کے اور ان کا جواب دیے بغیر اپنی بات کو دہراتے رہنا بحث کی کون سی قسم ہے۔ میں نے آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی یعنی ان کی حکومت کا مقصد اور غرض و غایت اقامت دین اور نفاذِ شریعت ہے، اور التزام و طاعت کا حکم فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی الجماعۃ ہے تو پھر شرائط کے ساتھ اس کے خلاف خروج کی اجازت کیوں دی ہے؟ ظاہر ہے کہ الجماعۃ کا تو التزام واجب ہوتا ہے۔ جس حدیث کی بنا پر خروج کو صرف جائز قرار دیا جا رہا ہے اس سے تو صاف طور پر معلوم

---

(۱) اشراق، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 3 (1,1)

ہوتا ہے کہ کفر بواح کا ارتکاب کرنے والی حکومت الجماعۃ کی حیثیت کھو چکی ہے اور اس کے خلاف خروج اور قیام صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ دینی فریضہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس کا تختہ الٹنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو وہ حکومت بالفعل موجود ہوگی اور برسرِ زمین موجود حقیقت کے طور پر اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی ایسا دارالاسلام موجود نہ ہو جہاں ہجرت کی جا سکے تو پھر اس حکومت کے زیرِ انتظام رہنے پر بھی مجبور ہونا پڑے گا' اور حالات کے مطابق حسب استطاعت دین کا کام جاری رکھا جائے گا۔ ایک موجود حقیقت کے طور پر ہم امریکہ' برطانیہ' جاپان' روس' بھارت' فرانس اور جرمنی کی حکومتوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں' اور ان ممالک کے مسلمان شہری ان کے انتظامی قواعد کی پابندی بھی کرتے ہیں اور ان کی فراہم کردہ سہولتوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں' لیکن کیا صرف موجود ہونے سے یہ حکومتیں الجماعۃ کی دینی اصطلاح کا مصداق بن سکتی ہیں؟

تیسری بات تو بڑی عجیب وغریب فرمائی گئی ہے کہ الجماعۃ کے باب میں دینی نصوص کا ہمیشہ یہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور جلیل القدر فقہاء اور علماء سے یہی نقل ہوتا آیا ہے' مگر حوالہ کسی ایک فقیہہ اور عالم کا بھی نہیں دیا گیا۔ علماء اور فقہاء نے یہ تو کہا ہے کہ اگر کسی حکومت میں شریعت نافذ ہو اور قرآن وسنّت کی بالادستی عملاً تسلیم کی جاتی ہو' مگر اس حکومت کا حکمران فسق ومعصیت کا ارتکاب کر رہا ہو تو اس کو معزول کرنے کے لیے پُرامن جدوجہد تو کی جائے مگر اس کے خلاف خروج اور مسلح جدوجہد نہ کی جائے۔ مگر یہ تو نہ کسی دینی نص میں آیا ہے اور نہ کسی فقیہہ کے قول میں آیا ہے کہ شریعت سے منحرف اور کفر کی مرتکب حکومت بھی الجماعۃ ہے اور اس کا التزام واجب ہے۔ ایسی حکومت کے بارے میں تو امام نوویؒ نے اجماع نقل کیا ہے کہ اس کا تختہ الٹنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے اگر وہ اس کی طاقت رکھتے ہوں۔ (۱)

کیا الجماعۃ کی علت صرف مجتمع رکھنا ہے؟

اشراقی نوجوانوں کے دلائل میں مرکزی مقام اس بات کو حاصل ہے کہ الجماعۃ کے قیام کی علت دین کو قائم کرنا نہیں ہے' بلکہ مجتمع رکھنا اور انتشار سے بچانا اس کی اصل علت ہے۔ اس بات کو یہ لوگ اپنے مضامین میں بار بار دہراتے رہتے ہیں اور اس کو ایک مسلّمہ اور بدیہی حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں' حالانکہ یہ ان کا تحکم اور ادّعاء ہے جس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ نظم اجتماعی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور دین

(۱) نووی شرح مسلم' باب وجوب طاعة الامراء۔

فطرت یعنی اسلام کا حکم ہے' لیکن کیا اس کا اصل مقصد اور غرض و غایت صرف اجتماعیت ہے؟ میں نے اپنے مضمون میں آیات واحادیث سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسلام میں اسلامی حکومت کی غرض و غایت اور مقصد و ہدف اقامت دین اور نفاذِ شریعت ہے۔ انہی آیات و احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل سنّت والجماعۃ کے ائمہ نے بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ خلافت و امامت یعنی مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کی اصل علت تنفیذِ احکام ہے۔ امام عبدالقاہر بغدادیؒ (متوفی ۴۲۹ھ) لکھتے ہیں:

> ''اور لازم ہے کہ مسلمانوں کا ایک حکمران ہو جو احکام نافذ کرے اور حدود قائم کرے۔'' (۱)

علامہ تفتازانی (متوفی ۷۹۳ھ) لکھتے ہیں:

> ''ضروری ہے کہ اُمت کا ایک امام ہو جو دین کو زندہ رکھتا ہو' سنّت کو قائم کرتا ہو' مظلوموں کو انصاف دلاتا ہو اور لوگوں کے حقوق وصول کر کے اصل مستحقین تک پہنچاتا ہو''۔ (۲)

تنفیذِ احکام' اقامتِ حدود' اقامتِ سنّت اور احیاءِ دین کا مطلب اقامت دین ہی ہے جسے مسلمانوں کے نظم اجتماعی کی علت اور فرض قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ النور کی آیت خلافت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کی علت اور مقصد تمکین دین اور قیامِ امن ہے۔ (النور: ۵۵) سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں اسلامی حکومت کا جو چار نکاتی منشور بیان کیا گیا ہے کہ وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے' اس کا حاصل بھی دین قائم کرنا اور شریعت نافذ کرنا ہے' اس لیے کہ دین و شریعت معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے ہی کا نام ہے۔ تحریک اشراق والے اس قسم کے دلائل کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو فرائض ہیں' الجماعۃ کے قیام کی علت نہیں ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنا بڑا دعویٰ کرنے والے یہ طفلانہ بات کیسے دہراتے ہیں۔ قرآن وسنّت سے تو روزِ روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ تمکین دین' اقامت دین اور تنفیذ شریعت اسلامی حکومت کے قیام کی اصل علت غائیہ ہے اور اصل مقصد و ہدف ہے۔ چلو مان لیتے ہیں کہ یہ فرائض ہیں تو جو حکومت اپنے فرائض ادا نہیں کرتی بلکہ اپنے فرائض کے ٹھیک برعکس کام کرتی ہے تو اس کا یہ حق

---

(۱) اصول الدین' ص ۲۷۱' اصل ۱۳' مسئلہ ۱۔

(۲) شرح مقاصد' طبع ۱۹۸۹ء' ج۵' ص ۲۳۳۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 4 (1,1)

پھر کیسے ثابت ہو گیا کہ اس کی وفاداری تقاضائے دین ہے؟ اور وہ اس الجماعۃ کا مصداق کیسے بن گئی جس کے التزام کو دین اور اس سے الگ ہونے کو جاہلیت کہا گیا ہے۔

ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) نے خلافت کی جو فنی تعریف کی ہے اس میں اس کے قیام کے اصل مقصد و ہدف کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

''خلافت سب لوگوں سے ان کی اخروی مصالح اور آخرت ہی کی طرف لوٹنے والی دُنیوی مصالح میں شریعت کا تقاضا پورا کروانے کے لیے قائم کی جاتی ہے' اس لیے کہ شارع کے نزدیک دنیا کے سارے مصالح اخروی مصالح کے تابع ہیں۔ پس خلافت حقیقت میں شارع کی نیابت ہے دین کی حفاظت کرنے میں اور دین کے ذریعے دنیا کی اصلاح کرنے میں۔''(۱)

شرح عقائد' شرح مواقف' الاحکام السلطانیۃ اور شامی میں بھی اسی طرح لکھا ہوا موجود ہے کہ خلافت و امامت (نظم اجتماعی) کے قیام کی علت اور غرض و غایت یہی ہے کہ دین کی حفاظت کی جائے اور دین ہی کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی جائے۔ ملاحظہ کیجیے میری کتاب ''اسلامی سیاست'' ص ۱۰۲۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں:

''خلافت وہ عمومی ریاست ہے جو دین کو قائم کرنے کی طرف متوجہ رہتی ہو''۔

شاہ صاحب نے آگے وہ فرائض بیان کیے ہیں جن کی ادائیگی کے بغیر اسلامی حکومت کے قیام کی اصل علت اور مقصد یعنی اقامت دین پورا نہیں ہوسکتا۔ ان کی تفصیل میرے مضمون میں موجود ہے' دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ شاہ ولی اللہؒ تو اس شخص کی حکومت کو بھی خلافت کے مفہوم سے خارج قرار دیتے ہیں جو اپنے دور کا قابل ترین اور بہترین انسان ہو' مگر اس کے ہاتھ سے اقامت دین کے فرائض میں سے کوئی ایک فرض بھی پورا نہ ہوسکا۔ (ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ' مقصد اول' فصل اول)

تحریک اشراق کے ترجمان بڑے تکرار و اصرار کے ساتھ کہتے پھرتے ہیں کہ کفر بواح کے مرتکب حکمران کی حکومت بھی الجماعۃ ہے جب تک کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہو' لیکن شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اقامتِ دین کے لیے قابل ترین اور بہترین انسان کی حکومت بھی خلافت نہیں کہلائی جاسکتی جب تک کہ وہ دین کو عملاً قائم نہ کرتی ہو۔

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون' ص ۱۵۱' بحث خلافت۔

علامہ سید محمد رشید رضا لکھتے ہیں:

''الجماعۃ سے مراد مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو کتاب و سنّت کے احکام کو نافذ کر کے دین کو قائم رکھتی ہو' لیکن صورت حال اب یہ ہوگئی ہے کہ ہر حکومت اور امارت الجماعۃ کا اطلاق اپنے اوپر کرتی ہے' اگرچہ سنّت کو مٹاتی اور گراتی ہو اور بدعت کو قائم اور نافذ کرتی ہو اور حدودِ شرعیہ کو معطل کرتی ہو اور فسق و فجور کے کاموں کو مباح ٹھہراتی ہو''۔ (۱)

آخر میں مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی اسی کتاب کا حوالہ دیتا ہوں جس کو ندیم صاحب نے میرے خلاف گواہ کے طور پر پیش کیا ہے' اگرچہ یہ گواہی فی الواقع انہوں نے اپنے خلاف پیش کی ہے' جیسا کہ اپنے مقام پر قارئین خود پڑھیں گے۔ اجتماعیت کا مقصد بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''کوئی اجتماعیت بجائے خود مطلوب نہیں ہوتی بلکہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کا صرف ذریعہ ہوا کرتی ہے' اور اس کی جو قدر و اہمیت بھی ہوتی ہے اسی مقصد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو جس اجتماعیت' جس وحدت اور جس تنظیم کی ہدایت فرمائی ہے اس سے مراد مطلق اجتماعیت' بے قید وحدت اور تنظیم برائے تنظیم ہرگز نہیں ہوسکتی بلکہ لازماً کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہوگا جس کی خاطر ہی لوگوں کو متحد اور منظّم زندگی بسر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز یہی مقصد وہ چیز ہوگی جو مسلمانوں کی کسی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ وہ اسلامی اجتماعیت اور تنظیم ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس مقصد کے حاصل ہونے کا واقعی ذریعہ بن سکتی ہو تب تو اسے اسلامی اجتماعیت اور اللہ و رسول کی پسندیدہ تنظیم قرار پانے کا حق ہوگا' لیکن اگر مسلمانوں کا یہ تنظیمی قافلہ اس مقصد کی طرف بڑھتا دکھائی نہ دیا تو اسے اسلامی اجتماعیت کہلانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ مسلمانوں کی یہ تنظیم کچھ ایسی واقع ہوئی ہو کہ اس سے الٹی اسلامی اجتماعیت کے اصل مقصد کی راہ رندھتی ہو اور اس کے ثمرات اس مقصد کے بجائے کسی اور ہی کی متاعِ مطلوب بنتے ہوں تو یہ اگرچہ مسلمانوں کی تنظیم ہوگی مگر اسلام کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ ہوگی اور اس کے بارے میں اس کی خواہش ہوگی کہ اسے توڑ دیا جائے' اس کی موجودہ بنیادیں ڈھا دی جائیں اور اس کی جگہ وہ تنظیم بپا کی جائے جس سے اس کا مقصدِ اجتماع پورا ہوتا ہو۔ وہ

(۱) المنار' ص ۳٦۷' ج٦' المائدۃ ۳٦'۳۷۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\m10-09 ishraqi tajdeed.inp 8/22/2016 3:30 PM PAGE 5 (1,1)

مقصد کیا ہے کہ جس کے لیے اسلام نے اپنے پیروؤں کو منظّم اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے؟ (جس کے جواب میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳‘ آل عمران کی آیت ۱۱۰ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کا حوالہ دینے کے بعد فرماتے ہیں) قرآن حکیم کے ان بیانوں سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ اسلامی اجتماعیت کا مقصد اقامت دین‘ امر بالمعروف اور شہادت حق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی اور مقصد مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کا حق بالکل نہیں رکھتا۔ جس طرح یہ جاہلی زندگی ہے کہ مسلمان منتشر اور بن سری فوج بنے رہیں اسی طرح یہ بھی سرتاپا جاہلیت ہی ہے کہ وہ دین حق کی علم برداری کے سوا کسی اور غرض سے متحد و منظّم ہوں‘‘۔ (۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

’’اسلام کو حکومت کا نظام بجائے خود مطلوب نہیں ہے بلکہ اہم مصالح اور عظیم مقاصد حاصل کرنے کا وہ محض ایک لازمی ذریعہ ہے اور ان مصالح و مقاصد میں سے بھی اوّلین اور بنیادی اہمیت شرعی قوانین کے نفاذ کو حاصل ہے‘‘۔ (۲)

حضرت مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی کتاب کا اقتباس کچھ تفصیل کے ساتھ اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ اسلامی اجتماعیت اور نظم اجتماعی کی اصل علت اور مقصد کے بارے میں قرآن وسنّت کی تعلیمات اور جلیل القدر فقہاء وعلماء کی تحقیقات کا جامع خلاصہ پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ انہوں نے نقل کر دیا ہے۔ ان تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام اور نظم حکومت کا مقصد صرف مجتمع رکھنا اور انتشار سے بچانا نہیں ہے‘ بلکہ اقامت دین‘ شہادتِ حق اور نفاذِ شریعت کے اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کا لازمی ذریعہ ہے‘ اور جو حکومت اس مقصد کے لیے کام نہیں کرتی وہ اسلامی حکومت اور الجماعۃ یعنی اسلامی اجتماعیت کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن اشراقی تحقیق یہ ہے کہ الجماعۃ کی اصل علت مجتمع رکھنا اور انتشار سے بچانا اور نفاذِ شریعت اس کا فرض ہے‘ اگر الجماعۃ اپنا یہ فرض ادا کرتی ہے پھر بھی اس کی وفاداری اور التزام دین کا تقاضا ہے‘ اور اگر وہ یہ فرض ادا نہیں کرتی پھر بھی اس کا التزام واجب ہے‘ بلکہ اگر صریح اور کھلے کفر کا ارتکاب کرتی ہے پھر بھی اس کی الجماعۃ کی یہ حیثیت باقی ہے‘ البتہ چار شرائط پوری کرنے کے بعد اس کے خلاف خروج کرنا صرف جائز ہے‘ واجب کسی صورت میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھلے کفر کا ارتکاب کرنے

---

(۱) اسلام اور اجتماعیت‘ ص ۷۹ تا ۸۳۔

(۲) اسلام اور اجتماعیت‘ ص ۱۳۹۔

والی حکومت کا التزام اور وفاداری بھی جائز ہے اور شرائط اربعہ کی تکمیل کے بعد شریعت کی پابند حکومت قائم کرنے کے لیے مسلح جدوجہد بھی جائز ہے۔ مسلمان ان دو راستوں میں سے جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں' اس لیے کہ کفر کی حکومت کے خلاف شرائط کی تکمیل اور استطاعت کے باوجود خروج واجب نہیں ہے ۔سبحان اللہ! یہ بات تو مسلمانوں کا ایک طفلِ مکتب بھی نہیں کہہ سکتا۔

شورائیت اور جمہوریت کا بنیادی فرق

تحریک اشراق والے اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں اور یہ ان کی فکر کا مرکزی نکتہ ہے' جس پر انہوں نے الجماعۃ کے بارے میں اپنی منفرد فکر کی تعمیر کی ہے کہ قرآن کی آیت کے مطابق مسلمانوں کے معاملات ان کے باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں' اس لیے جس حکومت کو مسلمانوں نے منتخب کر لیا ہو اور اسے ان کا اعتماد حاصل ہو تو وہ ان کے لیے واجب الالتزام الجماعۃ ہے خواہ وہ اپنا فرض منصبی ادا کرتی ہو یا ادا نہ کرتی ہو' یعنی خواہ نفاذِ شریعت کرتی ہو یا انسدادِ شریعت کی پالیسی اپناتی ہو۔ تحریک اشراق کا ایک اور ترجمان لکھتا ہے:

> ''مسلمانوں کی منتخب حکومت کو الجماعۃ تسلیم نہ کرنا ان کے مسلمان ہونے سے انکار کرنا ہے' کیونکہ شریعت کی رو سے یہ دونوں لازم وملزوم ہیں''۔ (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے یا تو اسلام کے شورائی نظام کو نہیں سمجھا' یا مغرب کے جمہوری نظام کو نہیں سمجھا' یا پھر دونوں کو نہیں سمجھا' اور اگر دونوں کو سمجھ لیا ہے تو پھر یہ دانستہ طور پر پاکستان کی موجودہ سیکولر حکومت کو دینی جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن دینی جواز مسلمانوں کے معتمد دینی اداروں ہی سے کسی کو مل سکتا ہے' اشراقی سکالروں کے المورد سے نہیں مل سکتا۔ اور دینی اداروں کی رائے تو یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت شریعت کی رو سے الطاغوت ہے الجماعۃ نہیں ہے اور اس کا التزام دینی تقاضا نہیں ہے' بلکہ شرعی طریق کار کے مطابق اس کا تختہ الٹنا دین کا حکم اور ایمان کا تقاضا ہے۔

مغرب کی سیکولر جمہوریت میں حاکمیت عوام کی ہے اور سپریم لاء عوام کی مرضی اور منشاء ہے' اور حکومت کے قیام کا مقصد عوام کی مرضی اور منشاء پوری کرنا ہے' اس لیے جس حکومت کو عوام نے منتخب کیا ہو اسے جب تک عوام کا اعتماد حاصل ہے اُس وقت تک اسے حکومت کرنے کا جمہوری حق حاصل ہے اور اس کے خلاف محاذ آرائی کرنا اور اس کو جائز حکومت تسلیم نہ کرنا عوام

---

(۱) اشراق' فروری ۱۹۹۶' ص ۳۸۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 6 (1,1)

کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ سے انکار کرنا ہے جو جمہوریت میں بہت بڑا اور سنگین ترین جرم ہے۔ لیکن اسلام کے شورائی نظام میں حاکمیت اللہ ربّ العالمین کی ہے اور سپریم لاء قرآن و سنّت ہے' اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے معیارِ اہلیت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے لیے ایسی حکومت بنائیں جو اقامت دین اور نفاذ شریعت کا فرض منصبی انجام دیتی ہو۔ حاکم حقیقی اور اس کے نازل کردہ سپریم لاء نے مسلمانوں کو سیکولر اور لادین حکومت منتخب کرنے کی سرے سے اجازت ہی نہیں دی۔ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے معیارِ اہلیت پر پورا اترنے والے افراد میں سے اس کو حکومت بنانے کا حق حاصل ہے جس کی اہلیت اور دیانت و امانت پر مسلمانوں کا یا ان کے معتمد نمائندوں کی اکثریت کا اعتماد ہو یعنی الجماعۃ۔ اور اسلامی حکومت وہی ہو سکتی ہے جو اسلام کے معیار پر بھی پوری اترتی ہو اور مسلمانوں کا اعتماد بھی اسے حاصل ہو۔ اہلیت کے بغیر انتخاب و اعتماد بھی کافی نہیں ہے اور اعتماد کے بغیر اہلیت بھی کافی نہیں ہے۔ اعتماد اور اہلیت دونوں جس حکومت کو حاصل ہوں وہی اسلامی حکومت ہے اور وہی الجماعۃ ہے' جس کا فرض منصبی یہ ہے کہ دین کو قائم رکھے' شریعت کو نافذ کرے اور غیر منصوص مسائل میں یعنی مباحات اور مصالح مرسلہ میں مسلمانوں کے معتمد و منتخب نمائندوں کے مشورے سے قانون سازی کرے اور ملک کا نظام چلائے۔ اسلام میں غیر منصوص امور میں مسلمانوں کی معتمد مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو ویٹو کرنے کا حق امیر المؤمنین کو بھی حاصل نہیں ہے' البتہ رسول اللہ ﷺ کو حاکم حقیقی کے مقرر کردہ نمائندے کی حیثیت سے سب کے خلاف ویٹو کا حق حاصل ہے۔ اس بنا پر جو حکومت اقامت دین اور نفاذِ شریعت کا فرض انجام نہ دیتی ہو' جو الجماعۃ کے قیام کی اصل علت ہے' اور قرآن و سنّت کی بالادستی تسلیم کرنے سے عملاً منحرف ہو چکی ہو تو اس کی الجماعۃ ہونے کی حیثیت شرعاً ختم ہو جاتی ہے' اس لیے کہ وہ حاکم اعلیٰ اور سپریم لاء سے باغی ہو چکی ہے اور اس کے احکام سے خروج کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ باغی اور خارجی کو تو الجماعۃ کے حقوق نہیں دیے جا سکتے خواہ وہ خروج و بغاوت اعتقادی ہو یا عملی ہو۔

یہ اسلام کے شورائی نظام کا خلاصہ ہے جس کے شرعی دلائل کی تفصیلات تفسیر' حدیث اور فقہ کی بنیادی کتابوں میں موجود ہیں' اور جدید دور کی زبان میں یہ تفصیلات مولانا مودودیؒ کی اسلامی ریاست' مولانا امین احسن اصلاحی کی اسلامی ریاست' میری کتاب اسلامی سیاست اور دوسرے علماء راسخین کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے بغاوت اور خروج کرنے والی حکومت کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت

کرنے کا حکم شرعی کیا ہے؟ یہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے‘ اپنے مقام پر اس کا حکم شرعی بیان کر دیا جائے گا۔ان شاء اللہ! لیکن یہ بات اسلام کے شورائی نظام میں مسلمات اور اجماعیات میں سے ہے کہ اللہ اور رسول سے باغی حکومت الجماعۃ نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہمارے اعمال کے نتیجے کے طور پر بطور عذاب ہم پر مسلط ہو جائے اور لوگ عدم استطاعت کی وجہ سے اس حکومت کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہوں اور اس کو امر واقعہ کے طور پر تسلیم بھی کرتے ہوں‘ لیکن اس کا شرعی جواز نہیں ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی منتخب حکومت کے الجماعۃ ہونے سے انکار ان کے مسلمان ہونے سے انکار ہے تو یہ بات بھی یا لاعلمی پر مبنی ہے یا پھر اس جذباتی بات کے ذریعے قارئین کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹانا مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے غیر اسلامی اعمال کو اس بنا پر تو جائز نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے عاملین و فاعلین مسلمان ہیں۔ ہمارے اس بگڑے ہوئے معاشرے میں لوگ مسلمان اور کلمہ گو ہوتے ہوئے بھی خونریزی اور دہشت گردی کرتے ہیں‘ سودی کاروبار کرتے ہیں‘ جوا بازی کرتے ہیں‘ چوری اور ڈکیتی کرتے ہیں‘ بدکاری اور فحاشی کا ارتکاب کرتے ہیں‘ رشوت کا لین دین کرتے ہیں اور دوسرے بہت سے منکرات اور رسوم و بدعات میں مبتلا ہیں‘ تو کیا ان اعمال و افعال کو اس بنا پر اسلامی اعمال کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے اعمال ہیں؟ اگر ان کو اسلامی اعمال نہیں کہا جا سکتا تو کیا ان کو غیر اسلامی کہنے سے یہ لازم آتا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے مسلمان نہیں ہیں؟ ہرگز ایسا نہیں ہے‘ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تو ہیں مگر غیر اسلامی اعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے اسلام کے معیار اہلیت پر پورا نہ اترنے والے لوگوں کو ووٹ دے کر اپنا نظم اجتماعی ان کے سپرد کر دیا ہو تو یہ ان کا ایک غیر شرعی عمل ہے‘ اس سے نہ یہ لازم آتا ہے کہ ووٹوں سے قائم شدہ حکومت الجماعۃ ہے اگرچہ وہ قرآن وسنّت کی برتری کو عملاً تسلیم نہ کرتی ہو اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ ووٹ دینے والے مسلمان نہیں ہیں‘ بلکہ اس سے جو چیز لازم آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ سچے اور شعوری مسلمان نہیں ہیں‘ بلکہ صرف نسلی اور رسمی مسلمان ہیں‘ اس لیے سرمایہ دار‘ جاگیردار اور پیشہ ور سیاسی لیڈر دھوکے اور فریب سے‘ ڈرانے دھمکانے سے یا رشوت سے ان سے ووٹ لے کر اپنی سیاست برائے تجارت کی دکان چمکا لیتے ہیں۔

علماء دین‘ دینی اداروں اور دینی تنظیموں کا فرض ہے کہ نسلی اور رسمی مسلمانوں کو شعوری اور سچے مسلمان بنانے کے لیے دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت کا کام تیز تر کر دیں اور مسلمانوں کے اندر

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 7 (1,1)

دین کا شعور اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس سے یہ تو کسی طرح بھی لازم نہیں آتا جیسا کہ اشراق والے کہتے ہیں کہ جب تک یہ شعوری مسلمان نہیں بنتے اس وقت تک ان کے غیر اسلامی عمل کو بھی اسلامی کہہ دیا جائے' اور ان کی منتخب کردہ غیر اسلامی اور سیکولر حکومت کو بھی اسلامی حکومت مان لیا جائے اور اس کو الجماعۃ کے حقوق دے دیے جائیں۔ البتہ یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ جس طرح مسلمانوں کے بہت سے معاشی اور معاشرتی اعمال غیر اسلامی ہیں مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اسی طرح ان کی منتخب کردہ غیر اسلامی حکومت کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اشراقی استدلال کے چند نمونے

☆تحریک اشراق کے ایک ترجمان ارشاد فرماتے ہیں کہ بچے کے دنیا میں آ جانے کے بعد اس کی پرورش کی ذمہ داری بہر حال اٹھانا پڑتی ہے خواہ طریقۂ ولادت جائز ہو یا ناجائز۔ بعینہٖ اسی طرح جب پاکستان کے مسلمانوں نے مل کر ایک حکومت بنا رکھی ہے تو اب اس کے جائز یا ناجائز ہونے سے بحث نہیں ہے۔[۱]

میرے بھائی! ذرا ٹھنڈے دل کے ساتھ تدبّر کیجیے' یہ مثال آپ کے خلاف جا رہی ہے۔ تولد کے بعد بچے کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا' لیکن صرف موجود ہونے کی بنا پر بچے کو جائز اور صحیح النسب بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ بعینہٖ اسی طرح غیر اسلامی اور سیکولر حکومت کے تولد کے بعد اس کے وجود سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وجود تو ابلیس اور دوسرے طواغیت عالم کا بھی ماننا پڑتا ہے' لیکن صرف موجود ہونے کی بنا پر الطاغوت کو الجماعۃ تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع ہے حکومت بالحق اور آپ مثال پیش کر رہے ہیں حکومت بالفعل کے لیے۔ البتہ غیر اسلامی حکومت نے تولد کے بعد جب اقامت دین اور نفاذِ شریعت کا کام شروع کر دیا اور اصلاح قبول کر کے عادل حکومت بن گئی تو ناجائز تولد کے باوجود الجماعۃ بن جائے گی۔ باقی رہی اصلاح کرنے اور نقائص دور کرنے کی کوشش تو یہ کوشش تو غیر مسلم حکمرانوں کی اصلاح کے لیے کرنا بھی دینی فریضہ ہے' لیکن جس طرح اسلام قبول کیے بغیر غیر مسلم مسلمان نہیں بن سکتا اسی طرح کسی مسلمان کی غیر اسلامی حکومت اقامت دین اور نفاذِ شریعت کا فریضہ ادا کیے بغیر اسلامی حکومت نہیں بن سکتی' البتہ حالات و وسائل کے مطابق اسے اسلامی

---

(۱) اشراق' مارچ ۱۹۹۶ء' ص ۵۰۔

بنانے یا تبدیل کرنے کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔ یہ وہ واضح اور کھلے دینی حقائق ہیں جو المورد کی دانش گاہ کے دانشوروں کو سمجھ لینے چاہئیں۔

☆ ایک دوسرے ترجمان نے لکھا ہے کہ معاشرتی اور سیاسی اداروں کو اس وجہ سے کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کا نظام مثالی لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر کوئی امام فاسق و فاجر ہو تو کیا اس کی اقتداء میں ادا کی جانے والی نمازیں اس وجہ سے نماز قرار نہیں پائیں گی کہ امام مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا؟(۱)

یہ مثال بھی برمحل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر امام نماز پڑھاتا ہی نہ ہو یا شرعی طریقے کے خلاف پڑھا رہا ہو' لیکن منبر و محراب پر اس نے قبضہ جمائے رکھا ہو تو کیا پھر بھی اسے جائز امام تسلیم کیا جائے گا؟ کیا مسجد بنانے اور امام مقرر کرنے کا مقصد صرف مجتمع ہونا ہے یا نماز باجماعت ادا کرنا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں تو نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر امام نماز شرعی طریقے کے مطابق پڑھا رہا ہے' مگر شخصی طور پر وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہو تو اس کی اقتداء میں پڑھی گئی نماز صحیح ہو گی اور اس کی قیادت میں کیا گیا جہاد بھی قبول ہو گا۔

مگر جہاد کے صحیح ہونے کے باوجود فاسق امام کو عادل امام کا مقام تو نہیں دیا جاسکتا۔ عادل کا معزول کرنا جائز ہی نہیں ہے لیکن فاسق امام کا معزول کرنا واجب ہے اور اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے۔ یہ ہے امامتِ صغریٰ کا اصل حکمِ شرعی جس کو یہ لوگ نظر انداز کر رہے ہیں۔ بس یہی حکم ہے امامتِ کبریٰ کا کہ اگر امیر اور امام شریعت کے مطابق امارت و امامت کر رہا ہو تو شخصی خرابیوں اور معیار مطلوب پر پورا نہ اترنے کے باوجود اس کی حکومت الجماعۃ ہو گی۔ لیکن اگر وہ شریعت کی بالادستی کو عملاً مانتا ہی نہ ہو' بلکہ سیاست و حکومت اور نظام اجتماعی میں مذہب و شریعت کی مداخلت کا قائل ہی نہ ہو' تو کیا صرف قبضہ جمانے اور بالفعل حکومت قائم کر لینے کی وجہ سے وہ الجماعۃ کے دینی حقوق کا حقدار بن سکتا ہے؟

یہ ہے وہ اصل سوال جو موضوعِ بحث ہے جسے نظر انداز کر کے بات کا رُخ دوسری جانب موڑنے کی کوشش کی گئی ہے' تاکہ الجھاؤ پیدا کیا جائے اور اصل مسئلے سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جائے۔

☆ اشراق کے سکالر ایک خلط مبحث کرتے ہیں کہ پاکستان میں مسلمانوں کو جب سیاسی

---

(۱) اشراق' اپریل ۱۹۹۶ء' ص ۱۸۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.inp 8/22/2016 3:30 PM PAGE 8 (1,1)

اقتدار مل گیا اور آئینی طور پر شریعت کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا گیا تو اس کے بعد یہاں بسنے والے مسلمانوں کے لیے پاکستان ہی الجماعۃ ہے۔[1]

یہ بات صحیح ہے کہ آئین کہ دفعہ ۲ میں کہا گیا ہے کہ اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ دفعہ ۲ الف میں قرار دادِ مقاصد کو دستور کا مستقل اور مؤثر حصہ قرار دیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے' پاکستان کے جمہور کو اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر اپنا اختیار و اقتدار استعمال کرنے کا جو حق حاصل ہے وہ ایک مقدس امانت ہے اور جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں کی جو تشریح اسلام نے کی ہے ان پر اس تشریح کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی قرآن وسنّت کی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔ دفعہ ۳۱ میں اسلامی طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کی سہولتیں مہیا کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ دفعہ ۲۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسنّت میں منضبط احکام کے مطابق بنایا جائے گا اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو قرآن وسنّت کے احکام کے منافی ہو۔ دفعہ ۶۲ میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اچھے کردار کا حامل نہ ہو' اسلام کے احکام سے انحراف میں مشہور ہو' اسلام کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو' اسلام کے فرائض کا پابند نہ ہو' کبائر سے اجتناب نہ کرتا ہو' فاسق ہو اور ایماندار و دیانت دار نہ ہو تو وہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا۔ دفعہ ۴۲ اور دفعہ ۹۱ کے تحت صدر اور وزیر اعظم دونوں کے لیے یہ حلف اٹھانا ضروری ہے کہ میں مسلمان ہوں' توحید پر' محمد رسول اللہﷺ کی ختم نبوت پر اور قرآن وسنّت کی جملہ تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں اور یہ کہ میں اسلامی نظریہ کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہوں گا جو قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے۔

ان دفعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاست کا آئین اسلامی ہے سیکولر نہیں ہے' لیکن الجماعۃ تو نہ کسی خطۂ زمین کا نام ہو سکتا ہے اور نہ کسی آئینی دستاویز کا نام بن سکتا ہے' بلکہ نظم اجتماعی اور نظم حکومت کا نام ہے۔ اور پاکستان کی حکومت عملاً ریاست کا نظام شریعت اور آئین دونوں کے خلاف لادینیت اور سیکولرازم کے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہے تو آخر ایسی حکومت کو کس طرح الجماعۃ کا شرعی نام دیا جا سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ شریعت سے عملاً

(۱) اشراق' اپریل ۱۹۹۶ء' ص ۱۶۔

منحرف اور باغی ہو بلکہ وہ ریاست کے بنیادی نظریے اور ملک کے آئین و دستور سے عملاً باغی ہو چکی ہو اور اپنے حلف کو کھلم کھلا توڑ چکی ہو؟ البتہ یہ صحیح ہے کہ پاکستان کی ریاست اسلامی ہے مگر حکومت تو غیر اسلامی ہے' اور موضوع بحث حکومت ہے ریاست نہیں ہے۔ باقی رہی پاکستان کی وفاداری' سالمیت' تحفظ اور دفاع کی بات تو یہ ملک کے ہر شہری پر لازم ہے اور دین کا تقاضا بھی ہے۔

مسئلے کا عملی پہلو

فکر اشراق کے ترجمان درج بالا عنوان کے تحت لکھتے ہیں: نظری بحث سے ہٹ کر ذرا مسئلے کے عملی پہلو پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے کشمیر کے مسئلے کو لیجیے! اپریل ۱۹۴۸ء میں جب پاکستان اور ہندوستان کے مابین کلکتہ معاہدہ ہوا تو مولانا مودودیؒ کا موقف یہ تھا کہ چونکہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ موجود ہے' لہٰذا پاکستان کے شہریوں کے لیے کشمیر کی جنگ میں شریک ہونا شرعاً جائز نہیں ہے' حالانکہ مولانا اس وقت کی حکومت کو غیر شرعی سمجھتے تھے' مگر انہوں نے غیر شرعی حکومت کے معاہدے کو سندِ جواز فراہم کی۔ (۱)

میں نے اپنے مضمون کے آغاز میں بالفعل حکومت اور بالحق حکومت کے درمیان جو فرق بیان کیا تھا' اس کو اگر نظر انداز نہ کیا جاتا تو کشمیر کے پرانے مسئلے کو نقل کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ثروت صولت کی کتاب ''مولانا مودودی کی تقاریر'' سے مولانا مودودی کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان میں صاف طور پر حکومت بالفعل کا ذکر ہے جو عملاً پاکستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی تھی' حکومت بالحق یعنی شرعی حکومت کا ذکر نہیں ہے۔ تو کیا صرف عملاً نمائندگی کرنے سے کوئی حکومت الجماعۃ کہلائی جا سکتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر غیر مسلم حکومتوں کو بھی الجماعۃ کا نام دے دیجیے' اس لیے کہ وہ بھی اپنے مسلمان شہریوں کی نمائندگی کرتی ہیں اور مسلمان شہری ان کے فیصلوں کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ مولانا مودودی اور مولانا عثمانی کے درمیان اختلاف اس بات میں نہیں تھا کہ ایک کے نزدیک اس وقت کی حکومت اسلامی اور شرعی تھی اور دوسرے کے نزدیک غیر اسلامی اور غیر شرعی تھی' بلکہ دونوں بزرگ اسے مسلمانوں کی نمائندہ حکومت تسلیم کرتے تھے اور دونوں اس کو اسلامی اور شرعی حکومت بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اللہ دونوں پر اپنا رحم فرمائے۔ آمین!

(۱) اشراق' اپریل ۱۹۹۶ء' ص ۲۸'۲۹۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.inp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 9 (1,1)

ان کا اختلاف جو بھی تھا ایک فقہی نکتے کی بنیاد پر تھا جس کا الجماعۃ کے شرعی مفہوم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' بلاوجہ اس غیر متعلق بحث کو یہاں چھیڑ دیا گیا ہے۔ شاید کھینچا تانی اسی کو کہتے ہیں۔ مولانا مودودی نے جس معاہدے کو سند جواز فراہم کی تھی اگر وہ شرعاً جائز نہیں تھا تو اس کو سند جواز فراہم نہیں کی جا سکتی تھی' خواہ شرعی حکومت نے کیا تھا یا غیر شرعی حکومت نے' لیکن اگر وہ جائز تھا اور مسلمانوں کی نمائندہ حکومت نے کیا تھا تو اس کو سند جواز فراہم کی جا سکتی تھی خواہ وہ نمائندہ حکومت اسلامی تھی یا غیر اسلامی۔ مگر عملاً قائم حکومت کے کسی جائز معاہدے کو تسلیم کرنے سے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حکومت الجماعۃ ہے اور اس کا التزام دین کا حکم ہے۔ دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ حکومت بالفعل کو حکومت بالحق بنانے اور غیر اسلامی حکومت کو اسلامی حکومت بنانے کے لیے کوشش کی جائے۔ دین کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مولانا مودودیؒ نے ۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو جہانگیر پارک کراچی کے جلسۂ عام میں تقریر کر کے مطالبہ نظام اسلامی کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ وہ مطالبہ درج ذیل نکات پر مشتمل تھا۔

دستور ساز اسمبلی اعلان کرے کہ:

۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے۔

۲) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳) پاکستان میں کوئی بھی خلافِ شریعت قانون نافذ نہ کیا جائے گا اور تمام خلاف شریعت قوانین منسوخ کیے جائیں گے۔

۴) پاکستان کی حکومت اپنے اختیارات شریعت کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرے گی۔

اس چار نکاتی مطالبے کے حق میں مولانا مودودی نے عوام میں مہم چلائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے دستور ساز اسمبلی کے اندر محنت فرمائی اور آخر کار قرار داد مقاصد پاس ہو گئی۔ لیکن اس مطالبے کے بعد کشمیر کے مسئلے کو بہانہ بنا کر مولانا مودودی کو اکتوبر ۱۹۴۸ء میں گرفتار کر لیا گیا اور مئی ۱۹۵۰ء تک نظر بند رکھا گیا۔

اشراقی دانشور اپنا خلط مبحث جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''جماعت اسلامی نے ایوب خان کے عہد میں انصاف کے لیے عدالتوں سے رجوع کیا' بھٹو صاحب سے قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا' ملک کے دستور پر جماعت نے دستخط کیے' جماعت اسلامی ملکی قانون کے تحت رجسٹرڈ ہے اور

اس کے ممبر اسمبلی میں جا کر حلف اٹھاتے ہیں۔ اگر اس ملک کے نظام کو طاغوتی قرار دیا جائے تو ان اقدامات کی کیا توجیہہ ہوسکتی ہے''؟[1]

اگر الجماعۃ کے شرعی مفہوم کے تعین پر اشراق کی دانش گاہ میں میرے بیان کردہ شرعی دلائل کے خلاف کوئی علمی مواد موجود ہوتا تو اسے سامنے لایا جاتا اور کوئی علمی استدلال کیا جاتا' لیکن ان حضرات نے بات کا رُخ دوسری طرف موڑ کر جماعت اسلامی سے اپنے اقدامات کی توجیہہ مانگنی شروع کر دی' حالانکہ جماعت کے ان اقدامات سے یہ تو یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ جماعت نے پاکستان کی حکومتوں کو بالفعل حکومتیں یعنی عملاً قائم اور موجود حکومتیں تسلیم کیا تھا' لیکن یہ تو ہرگز ثابت نہیں ہوگا کہ جماعت نے ان کو بالحق حکومتیں تسلیم کیا تھا اور ان کو الجماعۃ قرار دیا تھا۔

یہی وہ توجیہہ ہے جو حکومت بالفعل اور حکومت بالحق کے زیر عنوان میرے مضمون میں تفصیل کے ساتھ موجود تھی' اگر اس پر غور کیا گیا ہوتا تو مزید توجیہہ نہ مانگی جاتی۔ لیکن چونکہ اسے سمجھا نہیں جا سکا اس لیے مزید وضاحت عرض کیے دیتا ہوں۔

☆ جماعت اسلامی سے پابندی اٹھانا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اگر غیر شرعی مطالبہ ہے تو اس کے لیے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا بھی جائز نہیں ہے' لیکن اگر یہ دونوں کام جائز ہیں تو جائز کام کروانے کے لیے کسی بھی حکومت وقت کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے' خواہ وہ مسلمان کی حکومت ہو یا غیر مسلم کی حکومت ہو اور خواہ وہ مسلمانوں کی اسلامی حکومت ہو یا مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہو۔ اگر برسر زمین موجود حکومت کو امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرنا اور اپنے جائز کام کروانے کے لیے اس کی طرف رجوع کرنا اسے الجماعۃ تسلیم کرنا ہے تو پھر دنیا میں قائم غیر مسلم حکومتیں بھی الجماعۃ ہیں! اس لیے کہ ان کے مسلمان شہری ان کو وقت کی حکومتیں تسلیم کرتے ہیں اور ان سے اپنے جائز کام بھی کرواتے ہیں' حالانکہ اشراق والے کم از کم اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ الجماعۃ کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیت کو وہاں پر غیر حکومتی امیر منتخب کر کے اپنی الگ الجماعۃ بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔[2]

☆ جماعت اسلامی یا کسی بھی دینی تنظیم اور سماجی و اصلاحی انجمن کو رجسٹرڈ کرنا اگر شرعاً حرام ہے تو اسلامی حکومت کے پاس رجسٹرڈ کروانا بھی ناجائز ہے' لیکن اگر یہ حلال ہے تو غیر

(۱) اشراق' اپریل ۱۹۹۶ء' ص ۲۹۔

(۲) اشراق' جنوری ۱۹۹۶ء' ص ۴۱۔

E:\Ma-2005\Meesaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 10 (1,1)

مسلم حکومت اور الجماعۃ سے رجسٹرڈ کروانا بھی جائز ہے اور مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت کے پاس رجسٹرڈ کروانا بھی جائز ہے۔ مگر کسی بالفعل حکومت کے رجسٹروں میں نام لکھوانے اور اس کے دوسرے انتظامی قواعد کی پابندی کرنے سے آخر کس طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ اسے الجماعۃ تسلیم کرنا ہے! اتنی کھلی اور سادہ سی بات کو سمجھنا کوئی مشکل تو نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کھینچا تانی سے ان حضرات کا کیا مقصد ہے؟

☆ ملک کا موجودہ دستور اسلامی ہے سیکولر نہیں ہے' اس پر دستخط کرنا جرم نہیں ہے' لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ شریعت اور ریاست کے آئین دونوں سے منحرف ہو جانے والی اور بغاوت وخروج کرنے والی حکومت بھی الجماعۃ ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ آئینی طور پر ریاست اسلامی ہے مگر حکومت طاغوتی ہے۔

☆ اقامت دین کا فرض ادا نہ کرنے والی حکومت کو بھی الجماعۃ کہنے والے دانشور نے یہ کہہ کر بڑی دل دکھانے والی بات کی ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان نے اسمبلیوں میں جا کر طاغوت سے وفاداری کا حلف اٹھایا اور طاغوتی حکومت کو چلانے میں تعاون کیا۔ (۱)

جماعت اسلامی کے ارکان نے طاغوت سے وفاداری کا حلف کبھی بھی نہیں اٹھایا' بلکہ اسلامی نظریے کے تحفظ اور پاکستان کی ریاست کی سالمیت کے لیے کام کرنے کا حلف اٹھایا تھا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے آرٹیکل ۲۵ کے تحت ارکان اسمبلی کے حلف کی عبارت نکال کر پڑھ لیجیے (ص ۳۰۲)۔ اس میں طاغوت اور حکومت کی وفاداری کا ذکر کہاں ہے؟ میں نے پاکستان کے آئین کو طاغوتی آئین نہیں کہا' بلکہ آئین اور شریعت دونوں سے باغی حکومت کو طاغوت کہا ہے جس کی وفاداری کا حلف نہ ہم نے اٹھایا ہے اور نہ ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں۔

اسی طرح جماعت اسلامی کے ارکان نے طاغوتی حکومت کو چلانے میں تعاون نہیں کیا اور نہ کوئی صحیح الفکر اور فرض شناس مؤمن یہ کام کر سکتا ہے۔ حکومت کے غیر اسلامی اور غیر آئینی اقدامات پر گرفت کرنا' غیر اسلامی قانون کو روکنے کی کوشش کرنا' مباحث کے دوران اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دینی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنا' اسمبلی کے فلور پر پارلیمانی طریقۂ کار کے مطابق دعوتِ دین کا کام کرنا اور عوام کے جائز حقوق کے لیے آواز اٹھانا جماعت کے ارکان اسمبلی کا اصل کام ہے جو وہ کرتے رہے ہیں۔ اگر کسی نے یہ کام نہیں کیا یا اس کے

---

(۱) اشراق' اپریل ۱۹۹۶ء' ص ۲۹۔

خلاف کچھ کیا ہے تو وہ اس کی انفرادی غلطی تو ہو سکتی ہے مگر جماعت کی پالیسی نہیں ہو سکتی۔

باقی رہی یہ بات کہ آئین کی وفاداری کا حلف اٹھانا حکومت' اداروں' صدارتی آرڈیننسوں اور حکومتی فیصلوں کو تسلیم کرنے کا حلف اٹھانا ہے[1] تو یہ بات یا تو لاعلمی پر مبنی ہے اور یا پھر شدید بے انصافی کی بات ہے۔ حکومت نام ہے ریاست کے نظم اور اداروں کو چلانے والی انتظامیہ کا۔ اگر وہ آئینی اداروں کو شریعت اور اسلامی آئین کے مطابق چلاتی ہے تو اسلام اور آئین دونوں کا تقاضا ہے کہ اس کی حمایت کی جائے' اس لیے کہ ایسی حکومت الجماعۃ ہوتی ہے جس کی وفاداری ضروری ہے۔ لیکن اگر انتظامیہ آئینی اداروں کو اسلام اور آئین کے احکام کے خلاف چلا رہی ہے تو پھر اسلام اور آئین دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی حکومت کی مزاحمت کی جائے اور یہ ہم کرتے رہے ہیں۔ ہم پر طاغوت کی حکومت چلانے میں تعاون کرنے کا بے سروپا الزام لگانے والے اس دانشور سے میں ایک سوال کرتا ہوں جس کا جواب مجھے دینے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ اپنے ضمیر کو جواب دینا ہی کافی ہے' وہ سوال یہ ہے کہ طاغوتی حکومت کے سامنے اسمبلیوں کے فلور پر کلمۂ حق کہنا افضل الجہاد ہے یا طاغوت سے تعاون ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن و سنّت کی بالادستی سے عملاً انحراف کرنے والی اور سیکولرازم کے اصول پر حکومت کا نظام چلانے والی حکومت طاغوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا اس کو الجماعۃ کہنا طاغوت کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ تعاون ہے یا نہیں؟ الجماعۃ ایک دینی اصطلاح ہے۔ سیکولر حکومت کو یہ مقام دینا اسے دینی جواز فراہم کرنے کے مترادف ہے' اس نام کی وجہ سے عامۃ الناس اس کو تبدیل کرنے کا خیال دل سے نکال دیں گے اور اس کی وفاداری کو کارِ ثواب سمجھ لیں گے۔

☆ المورد کی دانش گاہ کے اس دانشور نے میرے دلائل کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے پوچھا کہ ترکی کے سیکولر دستور کے تحت کام کرنے والی رفاہ پارٹی کیا طاغوت کو سند جواز بخش رہی ہے؟ معلوم نہیں کہ یہ استدلال کی کون سی قسم ہے جو میرے خلاف پیش کی جا رہی ہے۔ اس کے جواب کے طور پر میں اس دانشور سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا رفاہ پارٹی نے ترکی کی سیکولر حکومت کو الجماعۃ کہا ہے؟ اور کیا اس کی جدوجہد طاغوتی نظام کو قائم رکھنے کے لیے ہے یا اس کو تبدیل کرنے کے لیے ہے؟ ترکی کے سیکولر نظام میں اسلامی تحریک نے حالات کے مطابق اپنے لیے حکمت عملی بنائی ہے جس کے دفاع کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

---

(۱) اشراق' مارچ ۱۹۹۶ء' ص ۲۹۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.isp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 11 (1,1)

سیکولر حکومت کو الجماعۃ کہنا میرے لیے مشکل ہے‘ خواہ ترکی کی سیکولر حکومت ہو یا پاکستان کی سیکولر حکومت ہو۔

نظام کی اصلاح اور علماء کی ذمہ داریاں

فکر اشراق کے ترجمان نے اس عنوان کے تحت دو باتیں لکھی ہیں اور دونوں باتیں صحیح ہیں‘ لیکن الجماعۃ کے شرعی مفہوم کے تعین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ رعایا پر حکمرانوں کے بنیادی حقوق دو ہیں‘ یعنی اطاعت اور خیر خواہی‘ اور ان حقوق کا ادا کرنا حکمرانوں پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ اللہ اور رسول کا حکم ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس کے ثبوت میں اطاعت اولوالامر کی آیت اور تین احادیث پیش کی گئی ہیں۔ (۱)

اس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مسلمان کے ہر کام کی اساس رضائے الٰہی کا حصول ہے اور امراء کی اطاعت و خیر خواہی بھی رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے‘ بشرطیکہ وہ ہماری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہوں اور اللہ کے دین کو قائم رکھتے ہوں‘ خواہ ان کے احکام ہم کو گوارا ہوں یا گوارا نہ ہوں اور خواہ تخصی طور پر وہ عادل و متقی ہوں یا ان کے اندر کچھ کمزوریاں بھی ہوں۔ لیکن اطاعت و خیر خواہی سے تعلق رکھنے والی نصوص کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ شریعت سے منحرف ہو جانے والی سیکولر حکومت بھی الجماعۃ ہے اور اس کا التزام و اطاعت واجب ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ علماء دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت و انذار کا کام کریں اور عوام کی تائید سے حکومت کی اصلاح کریں یا اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ (۲)

یہی تو فکرِ مودودی ہے اور یہی تو میرے دل کی بات ہے کہ عوام کی فکری اور عملی تطہیر کے بغیر پہلے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اصلاح و تربیت کا کام کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بنیاد رکھنے سے پہلے دوسری منزل کی تعمیر کا خواب دیکھنا۔ علماء اور دینی تنظیمیں اگر ایسا خواب دیکھنا نہیں چھوڑیں گی تو غیر اسلامی نظام تبدیل نہیں ہوگا‘ البتہ نظام کو چلانے والے بدلتے رہیں گے اور ایک طاغوت کی جگہ دوسرا طاغوت آتا رہے گا‘ مگر اس طرزِ عمل سے

(۱) اشراق‘ اپریل ۱۹۹۶ء‘ ص ۳۰۔
(۲) اشراق‘ اپریل ۱۹۹۶ء‘ ص ۳۰‘۳۱۔

الجماعۃ یعنی اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکے گی۔ لیکن اس صورتِ حال سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ جب تک عامۃ الناس کی تربیت نہیں ہوتی اور جب تک علماء اپنا فرض ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے اس وقت تک سیکولر شریعت سے منحرف حکومت کو بھی الجماعۃ تسلیم کر لیا جائے؟ اس طرح تو سیکولر حکومت کو دینی سند مل جائے گی اور لوگوں کے دلوں سے اسے بدلنے کا خیال ہی نکل جائے گا۔ البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ جب مسلمانوں کے اعمال کے نتیجے میں ہم پر سیکولر اور شریعت سے منحرف حکومت قائم ہو جائے تو اسے ایک امر واقعہ اور معروضی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے اور حالات و وسائل کے مطابق اسے بدلنے کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ مگر عوام کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ وہ حکومت ہے جس کو احادیث میں الجماعۃ اور سایۂ رحمت کہا گیا ہے اور اس کی وفاداری کارِ ثواب ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے' بلکہ ان کو یہ بتایا اور سمجھایا جائے کہ یہ سیکولر حکومت ہے جو ہمارے اوپر عذاب الٰہی کے طور پر مسلط ہو گئی ہے اور ہم پر اس کی وفاداری لازم نہیں ہے بلکہ اس کو بدل کر شریعت کی پابند حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنا فرض ہے۔

حدیث کی تشریح پر اعتراض اور اس کا جواب

☆ حضرت حذیفہ بن یمان ؓ کی پوری حدیث نقل کرنے کے بعد میں نے اپنے مضمون میں تلزم جماعت المسلمین وامامھم کی تشریح اس طرح کی تھی کہ ''تم مسلمانوں کی اس جماعت کے ساتھ رہو جو قرآن و سنّت کا التزام کرنے والے امیر پر مجتمع ہو خواہ وہ امیر معیاری مسلمان ہو یا اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی موجود ہوں' مگر جب تک وہ قرآن و سنّت سے منحرف نہ ہوا ہو اُس وقت تک اس کی اطاعت دین کا تقاضا ہے''۔ اس تشریح پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ قرآن و سنّت کا التزام کرنے کا ذکر تو حدیث میں موجود نہیں ہے بلکہ اپنی طرف سے اضافہ ہے' حالانکہ میں نے اس شرط کو حدیث کے متن کے طور پر ذکر نہیں کیا تھا بلکہ حدیث کی شرح کے طور پر ذکر کیا تھا' اور اس تشریح کا ماخذ وہ دوسری احادیث ہیں جن میں اقامت دین' حکم بالعدل' اقامت کتاب اللہ اور قیادت بکتاب اللہ کا ذکر ہوا ہے۔ ان احادیث کا ذکر چونکہ پہلے ہو چکا تھا اس لیے دوبارہ ان کا تکرار کرنا تحصیل حاصل تھا۔ اگر میری تشریح کا کوئی ماخذ موجود نہ ہوتا تو اعتراض کرنے اور اصلاح کرنے کی یقیناً ضرورت تھی' لیکن اس کا ماخذ اسی مضمون میں قریب ہی ذکر کر دیا گیا تھا تو اس کے باوجود اعتراض کرنا بحث و تحقیق کے اصول کے خلاف ہے۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.inp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 12 (1,1)

☆ حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ ''اگر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام موجود نہ ہو تو ان سارے فرقوں اور گروہوں سے الگ ہو جاؤ' اگرچہ تمہیں کسی درخت کی جڑ دانتوں سے پکڑنا پڑے اور اسی حالت میں تمہیں موت آ جائے''۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ''اگر مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہو گیا ہو اور کوئی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہو' اور تم تنہا حالات کا مقابلہ کرنے یا جماعت بنانے کی قوت بھی اپنے اندر نہ پاتے ہو بلکہ تمہارے اپنے دین و ایمان کو خطرہ درپیش ہو تو ایسی حالت میں کسی الگ محفوظ جگہ میں بیٹھ کر زندگی گزارنا بہتر ہے' جیسا کہ دوسری حدیث میں فتنوں سے بھاگنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے''۔ (۱)

میری اس تشریح پر اعتراض کیا گیا ہے کہ ''جماعت سازی کا ذکر تو اس حدیث میں نہیں ہے۔ یہ تو رسول ﷺ کے منہ میں اپنے الفاظ ڈالنے والی بات ہے''۔ حالانکہ میں نے رسول ﷺ کے مُنہ میں اپنے الفاظ نہیں ڈالے تھے' بلکہ ان الفاظ کا مفہوم رسول اللہ ﷺ ہی کے دوسرے الفاظ مبارکہ کی روشنی میں متعین کیا تھا جو ایک مسلّمہ طریقہ ہے۔ اس تشریح سے میرا مقصد ایک اشکال کا ازالہ تھا اور وہ اشکال یہ ہے کہ اس حدیث میں گوشہ گیری' عزلت گزینی اور لوگوں سے کنارہ کشی کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح محولہ بالا حدیث میں آیا ہے کہ مجاہد کے بعد وہ شخص افضل ہے جو کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو گیا ہو' اور اپنے ربّ کی عبادت کرتا ہو اور اپنے شر سے لوگوں کو اور لوگوں کے شر سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہو۔ (۲)

لیکن دوسری طرف قرآن و حدیث کی نصوص کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کام کرنا جہادِ کبیر ہے اور اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَکَنَ الْبَادِیَةَ فَقَدْ جَفَا)) (۳)

''جس نے آبادی سے کٹ کر صحرا اور جنگل میں سکونت اختیار کی اس نے ظلم کیا''۔

ظاہر ہے کہ احادیث ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔ حضرت حذیفہؓ کی حدیث اور دوسری احادیث میں جو اختلاف نظر آ رہا ہے یہ

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الدین الفرار من الفتن۔

(۲) صحیح مسلم' باب الجهاد والرباط ۔

(۳) مسند احمد' ج ۱' ص ۳۵۷۔

اختلافِ تضاد نہیں ہے بلکہ اختلافِ تنوع ہے' یعنی حالات کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی ہے۔عزلت گزینی' گوشہ نشینی اور بادیہ نشینی کی فضیلت اس وقت کے بارے میں بیان کی گئی ہے کہ جب اپنے دین وایمان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو اور لوگوں کے اندر رہ کر ان کے شر سے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو گیا ہو۔ اور لوگوں کے اندر رہ کر اصلاحی اور دعوتی کام کرنے کی فضیلت اس حالت کے بارے میں ہے جب کہ مذکورہ خطرہ موجود نہ ہو' اور اصل عزیمت کا حکم یہی ہے کہ اپنے ایمان کو بھی بچایا جائے اور دوسروں کو بھی جہنم سے بچانے کی کوشش کی جائے اور اس سلسلے میں ہر قسم کے مصائب و آلام اور مظالم کو برداشت کر کے دعوتی کام تسلسل کے ساتھ کیا جائے۔ البتہ بعض اوقات انتہائی قسم کی مجبوری کی حالت میں گوشہ گیری اور صحرا نشینی کی زندگی اختیار کرنے کی رخصت ہے۔ یہ رخصت اس قسم کی صورتِ حال سے متعلق ہے جس سے اصحابِ کہف دوچار ہوئے تھے۔انہوں نے اپنی قوم سے الگ ہونے کی وجہ اس طرح بیان کی تھی کہ ''اگر یہ لوگ تمہاری خبر پا لیں تو یا تم کو سنگسار کر دیں گے اور یا اپنے مذہب کی جانب لوٹا دیں گے اور اس صورت میں تم ہرگز فلاح نہیں پا سکو گے''۔(الکھف: آیت ۲۰) بس ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر زندگی کے دن پورے کرو۔

باقی رہی جماعت سازی کی بات تو میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ جماعت سازی کا جواز یا وجوب حضرت حذیفہؓ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے' بلکہ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر دعوتِ دین کا کام کرنے والی کوئی تنظیم موجود ہو تو اس کے ساتھ مل کر کام کیا جائے' یا خود تنظیم بنا کر منظم کام کیا جا سکتا ہو تو بہتر ہے' ورنہ پھر سب سے الگ ہو کر انفرادی زندگی گزاری جائے۔ میرے ذہن میں چونکہ دین کی دعوت کے لیے دینی تنظیم کی ضرورت کے دوسرے دلائل موجود تھے جو میرے ایک تفصیلی مقالے میں دیکھے جا سکتے ہیں' (تفہیم المسائل حصہ اول) اس لیے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے جماعت سازی کی بات کی تھی۔ اشراق لکھتا ہے کہ اگر اس روایت پر (حذیفہؓ کی روایت) تدبر کی نگاہ کی جائے تو یہ جماعت سازی کی ممانعت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے تو جب تدبر کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس سے بدعت و ضلالت اور فتنوں کی جانب بلانے والی جماعتوں کی ممانعت تو یقیناً ثابت ہوتی ہے ہے مگر دعوت و اصلاح کے لیے جماعت سازی کی ممانعت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ حدیث کا سیاق و سباق اور موضوع کلام فتنوں کے بارے میں ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ فتنہ بپا کرنے والے فرقوں سے الگ ہو جاؤ۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms10-09 ishraqi tajdeed.inp 8/22/2014 3:30 PM PAGE 13 (1,1)

اس کے بعد اشراق کے یہ فاضل مقالہ نگار دیو بندیوں‘ بریلویوں‘ اہل حدیث اور دوسرے فرقوں کی باہمی تضلیل وتفسیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ الجماعۃ کی برادر تنظیمیں کس طرح بن سکتی ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی‘ میں نے باحوالہ دلائل کے ساتھ لکھا تھا کہ احادیث میں الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر ہوا ہے جو سنّت رسولؐ اور سنّت اصحاب رسولؓ کا التزام کرتے ہوں‘ اگرچہ ان کے پاس حکومت نہ ہو جن کو اہل سنّت والجماعۃ کہا جاتا ہے ۔اور تمام مکاتب فقہ اور تمام دینی تنظیمیں جو اس اصول کی پابند ہیں وہ سب کی سب اہل سنّت والجماعۃ میں شامل ہیں‘ اور فرقہ واریت پر مبنی تنظیمیں تو جائز ہی نہیں ہیں۔

(جاری ہے)

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ(26)

پاکستان (۵)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

مسلمانانِ ہند کی احیائی تحریکیں

1857ء کی جنگِ آزادی میں شکست کے باوجود اور حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوصف مسلمان رہنما اس کوشش میں لگے رہے کہ عوام کو بہتر مسلمان بنا کر منظّم کردیں' تاکہ وہ اپنی زائل شدہ حیثیت اور مقام دوبارہ حاصل کریں۔ اس سلسلے میں مختلف تحریکیں جاری ہوئیں' مثلاً:

(1) تبلیغی' جس کے علم بردار مولوی کرامت علی جون پوری تھے۔ انہوں نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی مذہبی بیداری کے لیے انتھک کوششیں کیں۔

(2) دینی تعلیم' جس کی داغ بیل دارالعلوم دیوبند کی شکل میں پڑی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اس کے قائد تھے۔

(3) سیاسی' جسے عام طور پر وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک سید احمد بریلوی کے خلفاء ومریدین نے منظّم کی۔ اس کی غرض وغایت یہ تھی کہ ہندوستان میں دعوت وجہاد کا سلسلہ جاری رہے' تاکہ یہاں سے روپیہ اور مجاہدین برابر قبائلی علاقے میں ستھانہ کے مقام پر اُن کے مرکز میں پہنچتے رہیں۔ سب سے زیادہ قربانیاں اسی جماعت کو دینا پڑیں۔

مسلمانوں کے سامنے ملکی وملّی مقاصد کے لیے غیر مسلموں سے اتحاد اور اُن کے ساتھ مل کر سعی وجدوجہد کی صورت اس لیے باقی نہ رہی تھی کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ انگریزوں کے آغازِ تسلط ہی میں اُن کے ساتھ شریک ہوگیا تھا۔ سکھوں اور مرہٹوں نے اپنے مقاصد ومفادات کے لیے فرقہ پرستی کی جو آگ بھڑکائی تھی' وہ ملک میں شدید تفرقے کا باعث بن گئی' جس سے انگریزوں کے لیے اپنی حکومت کے قیام واستحکام میں بہت سہولت ہوگئی۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزی حکومت کا مسلمانوں پر خصوصی عتاب اور مسلمانوں کا حکومت سے عدمِ تعاون اور اس کے مقابلے میں حکومت

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms-pakistan-4.inp 8/22/2014 3:35 PM PAGE 1 (1,1)

اور غیر مسلموں کا باہمی تعاون واتحاد روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو چکا تھا۔ مسلمان نہ اپنے آپ کو بدلنے پر تیار تھے' نہ حالات کو بدلنے پر قادر تھے۔ ان کا مستقبل روز بروز تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے ماتحت نظم ونسق' تجارت اور کاروبار وغیرہ کے دوسرے معاشی وسائل پر غیر مسلم قابض ہو چکے تھے۔ اس نازک موقع پر سرسید آگے بڑھے۔ انہوں نے حکومتِ وقت کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کی سیاسی و معاشی بحالی کی کوشش کی۔ سرسید نے مغربی تعلیم اور بالخصوص سائنس کی اہمیت کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی' جس کے بغیر وہ حکومتی نظام میں اپنی جگہ لینے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہو سکتے تھے۔ اُن کے رفقائے کار میں محسن الملک' وقار الملک' مولوی چراغ علی' شبلی نعمانی' مولوی ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اِن نامور مصلحین کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی' علمی' ادبی اور سیاسی احیاء کی وہ ہمہ گیر تحریک وابستہ ہے جسے علی گڑھ تحریک کہتے ہیں۔ 1875ء میں علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا گیا تھا جو دو سال بعد کالج میں اور 1920ء میں یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ سرسید نے ایک طرف تو انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی (دیکھئے اُن کا رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'') اور دوسری طرف مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ انگریزوں سے مغائرت چھوڑ کر اُن کے طرزِ فکر و معاشرت کا مطالعہ کریں۔ انہوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کو جدید سائنس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ بعض لوگوں کی مخالفت کے باوجود علی گڑھ کالج کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور جلد ہی یہ مسلمانانِ ہند کا ایک بڑا تعلیمی ادارہ بن گیا۔

سرسید کی خواہش تھی کہ مسلمان سیاسی بحث مباحثے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی تعلیمی ترقی میں کوشش کریں۔ چنانچہ 1886ء میں انہوں نے ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس'' کی بنیاد رکھی' جسے جلد ہی ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کا نام دیا گیا۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوتے اور مسلمانوں کے رہنما جمع ہو کر قومی اور تعلیمی ترقی کے مسائل پر غور وخوض کرتے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے پہلے یہ کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی افکار و خیالات کے اظہار کا واحد ذریعہ تھی۔

سرسید کی تعلیمی تحریک کے اثرات بہت دور تک پھیلے۔ مولانا شبلی نعمانی نے' علی گڑھ تحریک سے اختلاف کی صورت میں' لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی اور اس کے نصاب میں مذہبی اور مغربی سائنسی علوم کو سمونے کی کوشش کی۔ بنگال میں نواب عبداللطیف کی کوششوں سے مسلمانوں میں مغربی سائنس کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر اسلام سے جو بے رخی پیدا ہونے لگی تھی' اُس کی اصلاح میں سید امیر علی نے بڑا کام کیا۔ اُن کی نگارشات نے انگریزوں اور انگریزی زدہ

لوگوں کی نگاہ میں اسلام اور اسلامی تاریخ وثقافت کی توقیر بڑھائی۔ 1884ء میں انجمن حمایتِ اسلام، لاہور اور سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی قائم ہوئے جو اغراض ومقاصد کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک ہی کی شاخیں تھیں۔

ہندو احیائی تحریکیں

ہندوؤں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں سبقت کی اور دوسروں سے پہلے مغربی خیالات اور تہذیب کے زیر اثر آئے۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ خوب تعاون کیا۔ کارنوالس کے دوامی بندوبست نے ایک طرف مسلمانوں کو تباہ کیا تو دوسری طرف ہندو زمینداروں کا ایک خوشحال طبقہ پیدا کیا جو انگریزی حکومت کا حامی اور مددگار تھا۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں پر انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر پڑنے لگا۔ ان کے ہاں خیالات کا ایک نیا دھارا بہنے لگا، جس میں مغرب کی وسیع المشربی کے ساتھ ہندو مت کے مذہبی احیاء کا جذبہ ملا ہوا تھا۔ اس تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے (1774ء۔1834ء) تھے۔ وہ سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے بھی عالم تھے اور ان کے خیالات میں اسلام کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ وہ ایک خدا کے قائل تھے اور بت پرستی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف تھے۔ وہ ہندوؤں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کے حامی تھے اور دوسرے مذاہب کو بھی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس تحریک نے آگے چل کر ''برہموسماج'' کی شکل اختیار کی۔ کیشب چندر سین کی قیادت میں یہ تحریک خالص خدا پرستی کی تحریک ہوگئی۔ اس کی رو سے تمام مذاہب کی کتابیں یکساں مقدس ہیں۔ کیشب چندر سین سماجی اور تعلیمی اصلاح کے پرزور حامی تھے۔ برہموسماج کی چند شاخیں پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی قائم ہوئیں۔ پنجاب میں سردار دیال سنگھ مجیٹھا اس کے سرگرم حامی تھے۔ ان کی روشن خیالی اور وسیع المشربی کی یادگاریں دیال سنگھ کالج اور دیال سنگھ پبلک لائبریری کی صورت میں اب بھی قائم ہیں۔

اس کے بالکل برعکس جارحانہ ردّعمل کے طور پر آریا سماج تحریک شروع ہوئی۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی (1824ء۔1883ء) تھا۔ اُس نے ویدوں کو ہندو دھرم کی بنیاد قرار دیا اور ہندوؤں کو ویدوں کی پیروی کی تلقین کی۔ وہ توحید کا قائل تھا اور اسے ویدوں سے ثابت کرتا تھا اور ذات پات کی تفریق کے سخت خلاف تھا۔ اس کی تعلیمات نے ہندوؤں میں ایک جارحیت پسندانہ تعصب کی پرورش کی۔ آریا سماج تحریک 1875ء میں قائم ہوئی اور بہت جلد شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ لالہ ہنس راج اور لالہ لاجپت رائے اس تحریک کے زبردست کارکنوں میں تھے۔ لاہور کا ڈی اے وی کالج (جواب اُسلامیہ کالج، سول لائنز) کہلاتا ہے، اسی تحریک کے زیر اثر قائم کیا گیا تھا۔

آریہ سماج کے بعد جنوبی ہند میں تھیوسوفیکل سوسائٹی قائم ہوئی، جس کا مقصد ہندو فلسفے اور

E:\Ms-2005\Meesaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms-pakistan-4.inp 8/22/2014 3:35 PM PAGE 2 (1,1)

ویدک تعلیمات کا پرچار تھا۔ اس سوسائٹی کا اثر تعلیم یافتہ ہندوؤں نے سب سے زیادہ قبول کیا اور ان کے ذہن میں ایک ایسے ہندوستان کا خاکہ بس گیا جس میں ہندوؤں کے سوا کسی اور قوم کی گنجائش نہ تھی۔ ہندو عصبیت کی اس بیماری کا برصغیر کی سیاست پر، خصوصاً اُن علاقوں پر جن پر پاکستان اب مشتمل ہے، دوررس اور دیرپا اثر پڑا۔ انیسویں صدی میں اردو ہندی کا قضیہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ یہی طرزِ فکر تھا جو بعد میں ایک طرف بال گنگا دھر تلک جیسے تشدد پسند اور دوسری طرف مدن موہن مالویہ جیسے اعتدال پسند ہندو رہنماؤں کے افکار میں نمودار ہوا اور جس نے برصغیر میں صحیح قومی اتحاد کا قیام ناممکن بنا دیا۔

عام سیاسی بیداری

مغربی تعلیم کی ترویج کے ساتھ ساتھ برصغیر میں رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھیلنا شروع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک محدود اور مختصر طبقے سے ہوا، جو انگریزی تعلیم سے فیض یاب ہو کر مغربی سیاسی نظریات سے آگاہ اور متاثر تھا، عموماً خوشحال بھی تھا اور اعلیٰ ملازمتوں اور ملکی معاملات میں اپنے حصے کا طلب گار تھا۔ بہرحال ان لوگوں کی دولت برطانیہ سے وفاداری پوری طرح مستحکم تھی۔

برطانیہ نے ہندوستان میں اپنی بنیادیں مضبوط کر لینے کے بعد یہاں آئینی اصلاحات جاری کرنے کا بندوبست کیا، جن کا آغاز لارڈ کیننگ وائسرائے کے عہد ہی میں ہو گیا تھا۔ اکثر انگریز افسر نسل و رنگ کے تعصب کی بنا پر اہل ہند کو اپنے برابر، اور نظم و نسق کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم ان میں بعض ایسے آزاد خیال افراد بھی موجود تھے جو اہل ہند کو تھوڑے بہت آئینی حقوق دینے کے حق میں تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا دل ہی دل میں کڑھنا ٹھیک نہیں، لہٰذا ان کے لیے جی کی بھڑاس نکالنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں چند ممتاز ہندو لیڈروں نے 1885ء میں ''انڈین نیشنل کانگریس'' کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں پارسی اور مسلمان عمائد بھی اس میں شامل تھے، لیکن مسلمانوں کے رہنما سرسید نے اپنی دُوررَس سیاسی بصیرت سے دیکھ لیا کہ سیاسی حقوق کے مطالبے میں یہ ہندو مسلم اشتراک مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہ ہو گا، اس لیے کہ جو حقوق اور فوائد بھی ملیں گے ان پر ہندو اپنی کثرتِ تعداد، بہتر تعلیم اور قومی تنظیم کے باعث قابض ہو جائیں گے۔ سرسید کی مخالفت کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان عموماً کانگریس سے الگ رہے اور اُس زمانے میں سیاسی اعتبار سے بھی اُن کی ترجمانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کرتی رہی۔

1880ء میں میونسپل کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے اور 1892ء میں صوبائی کونسلوں کے لیے انتخاب کا طریقہ جاری ہوا تو چونکہ انتخابات مخلوط تھے، اس لیے مسلمان اقلیت والے علاقوں ہی میں نہیں، اکثریت والے علاقوں میں بھی بالکل بے بس ہو کر رہ گئے، نہ حکومت ان کے تحفظ پر متوجہ ہوئی نہ

نیشنل کانگریس نے ان کے حقوق کی نگہداشت کا کچھ خیال کیا' حالانکہ وہ پورے ملک کی نمائندگی کی دعوے دار تھی۔ بعض مسلمان رہنماؤں نے کانگریس کے رہنماؤں سے تلافی کی درخواستیں کیں' لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اور مسلمان اپنے تحفظ کی تدبیروں پر سرگرمی سے غور کرنے لگے۔

تقسیمِ بنگال

لارڈ کرزن کے عہد میں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر 1905ء میں صوبہ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی' کیونکہ صوبے کی وسعت اور آبادی کی کثرت کے باعث نظم ونسق کی حالت بہت خراب تھی' خصوصاً مشرقی بنگال میں نظم ونسق ناگفتہ بہ تھا۔ وہاں جرائم کا ارتکاب کھلم کھلا ہو رہا تھا۔ رسل ورسائل کے وسائل بری حالت میں تھے۔ عوام کی تعلیم اور اقتصادی ترقی نظرانداز کی جا رہی تھی اور یہاں کی آمدنی مغربی بنگال کی ترقی پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا' جس میں مسلمان اکثریت میں تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے ہی سے بنگالی مسلمان طرح طرح کی ناانصافیوں کا ہدف بنتے چلے آ رہے تھے۔ اُن کی اپنی حکومت جانے کے ساتھ ہی اُن کی خوشحالی بھی مفقود ہو گئی۔ صنعت وتجارت کے شعبوں سے تو انہیں پہلے ہی نکال دیا گیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ مسلمان زمینداروں اور کسانوں کو بھی معاشی اعتبار سے تباہ کیا جانے لگا۔ 1793ء کے بندوبست دوامی نے مسلمان زمینداروں کو ختم کر دیا۔ مالیہ جمع کرانے والے ہندو سرکاری ملازمین کو اراضی کا مالک قرار دیا گیا اور مسلمانوں کی حیثیت مزارعین سے بھی کمتر ہو کر رہ گئی۔ اسلامی مدارس کے لیے عہد اسلامی میں جو جاگیریں وقف تھیں' انہیں ضبط کر کے مسلمانوں کے لیے حصولِ تعلیم کو ناممکن بنا دیا گیا' کیونکہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں اپنے مذہبی رجحانات یا معاشی حالات کی بنا پر داخل نہیں کرا سکتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ 1837ء میں فارسی کے بجائے انگریزی زبان کو دفتری زبان بنا کر مسلمانوں کو سرکاری ملازمت کے لیے بھی ناقابل بنا دیا گیا۔ اسلامی حکومت کے خاتمے پر تقریباً ایک لاکھ سپاہی بے کار ہو کر کاشت کاری پر مجبور ہوئے تھے اب سرکاری ملازمتوں سے برطرف ہونے والے ہزاروں افراد اپنے کنبوں سمیت زمینوں پر آباد ہونے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقسیم در تقسیم کے باعث زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مزارعین کے لیے اس سے پیٹ بھر اناج حاصل کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ ہندو زمیندار اکثر شہروں میں رہتے اور ان کے گماشتے لگان اور کئی دوسرے ناواجب ٹیکس وصول کرنے کے لیے کسانوں کے ساتھ انتہائی بے رحمی سے پیش آتے۔ ان کے ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انہیں اکثر پچاس سے ساٹھ فی صد شرح سود پر ہندو مہاجنوں سے قرض لینا پڑتا تھا' جس سے وہ پور طرح ان کے شکنجے میں جکڑتے چلے گئے۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq december2005\ms-pakistan-4.inp 8/22/2014 3:35 PM PAGE 3 (1,1)

یہی سلوک خود انگریزوں نے اُن کسانوں سے روا رکھا جو اُن کے لیے نیل کی کاشت کرتے تھے۔ اوّل تو انہیں اُجرت بھی اتنی کم ملتی تھی جو اُن کے معمولی اخراجات کی بھی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر کوئی کاشت کار نیل کی مقررہ مقدار مہیا نہ کر سکتا تھا تو نہ صرف اسے کوڑے لگوائے جاتے بلکہ اس کے مکان اور فصل کو بھی آگ دکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح کپڑے کی تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر انگریزوں نے نہایت معمولی اجرت پر مسلمان جولاہوں سے کام لینا شروع کیا اور انکار کرنے والوں کو ایسی خوفناک سزائیں دیں کہ کئی کاریگروں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے تاکہ کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ بقول ولیم ہنٹر مسلمان تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو اس صوبے میں اتنی اقتصادی خوشحالی اور تعلیمی برتری حاصل ہو چکی تھی جسے ایک سو سال میں بھی مٹانا ممکن نہ تھا۔

تقسیمِ بنگال سے ہندوؤں کو نئے صوبے میں اپنی برتری اور اجارہ داری ہاتھ سے نکلتی نظر آئی تو انہوں نے اسے اپنے قومی اتحاد و وقار پر ضربِ کاری قرار دیتے ہوئے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلا دی۔ کانگرس نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کیے اور بنگالی ہندو تشدد اور دہشت پسندی پر اتر آئے۔ انہوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا اور ایک طرف تو انگریز افسروں کو گولی کا نشانہ بنانے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ فساد پر اتر آئے۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ تقسیمِ بنگال سے مسلمانوں کو قدرے نفع پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنی سیاسی زبوں حالی کا شدت سے احساس ہوا اور انہوں نے اپنے تحفظ کے لیے نمائندہ اداروں میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ آل انڈیا مسلم لیگ نے حکومت کو پیش کیا جو 1906ء میں قائم ہوئی تھی۔

(جاری ہے)